رام رامائن اور بابر

از

پی ایس سریدھر مورتی
ایڈووکیٹ

6 / نومبر 1988 کی صبح بنگلور راج بھون میں رام، راماین اور بابر (اُردو) کا اجراء اُڑیسہ کے گورنر عزت مآب بی این پانڈے کے ہاتھوں ہُوا۔
تصویر میں (دائیں سے بائیں) ناشر وی ٹی راج شیکھر، مصنف بی ایس سریدھر مورتی، عزت مآب بی این پانڈے اور مترجم پروفیسر میجر خلیل الرحمٰن دیکھے جا سکتے ہیں۔
(تفصیلی رپورٹ کے لئے ٹائٹل کا صفحہ تین دیکھئے)

رام

رامائن

اور

بابر

مصنف : پی یس سریدھر مورتی ایڈوکیٹ

مترجم : پروفیسر میجر خلیل الرحمٰن

اور

ین سیّد عمر یم اے

ناشر : دلیت ساھتیہ اکیڈمی

۱۰۹۔ ساتواں کراس۔ پیالیس لوئر آرچرڈس۔ بنگلور 560 003

قیمت : 6 روپے

D.O.No. 525/PSG

B N. PANDE
GOVERNOR ORISSA

RAJ BHAVAN
BHUBANESWAR-751008

4 August 1988.

Dear friend Shri Sridhara Murthy,

Due to my very busy engagements I am rather late in acknowledging the receipt of your letter and a booklet entitled : RAMA, RAMAYANA AND BABAR.

I found your booklet very interesting as well as authentic. You have successfully demolished the bigotted non-history written by Dr. Sukul. It is unfortunate that bigotted fanaticism and misguided fundamentalism is creating havoc in India. I am glad that Dalit Sahitya Academy, Bangalore is doing very valuable work in meeting this fanatical challenge. I am trying to create understanding between Hindus and Muslims in my own humble way.

With warm personal regards,

Yours sincerely,

B. N. Pande
(B. N. Pande)

Sri P. S. Sridhar Murthy,
Advocate,
No.25, Gandhi Bazaar,
Basavanagudi,
Bangalore - 560004.

عزّت مآب گورنرِ اُڑیسہ جناب بی ین پانڈے کا خط بنام مصنفِ کتاب جناب سریدھر مورتی

مورخہ ۴ر اگست ۱۹۸۸

محبوب دوست شری سریدھر مورتی

اپنی مشغولیات کے باعث آپ کی کتاب "رام، راماین اور بابر" اور آپ کے خط کی رسید کافی عرصے کے بعد دے رہا ہوں۔

میں آپ کی کتاب کو بہت دلچسپ اور مستند پاتا ہوں۔ آپ نے بڑی کامیابی کے ساتھ ڈاکٹر شکل کی متعصبانہ بے تاریخ کو ڈھا دیا ہے۔ بدقسمتی سے تعصب اور غلط بنیادیت پسندی ہندوستان میں تباہی مچا رہی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ دلیت ساہتیہ اکیڈمی بنگلور اس تعصبانہ چیلنج کا مقابلہ کرنے میں بڑا قابلِ قدر کام کر رہی ہے۔ میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں باہمی سمجھداری پیدا کرنے کی اپنے طور پر تھوڑی سی کوشش کر رہا ہوں۔

پُرخلوص ذاتی قدردانی کے ساتھ

آپ کا مخلص

دستخط

(بی ین پانڈے)

بنام شری پی ایس سریدھر مورتی ایڈوکیٹ
نمبر ۲۵ - گاندھی بازار - بسونگڈھی
بنگلور - 560 004

فہرست

پیش لفظ

آلیور گولڈ سمتھ نے کہا ہے کہ احمقانہ حرکتیں بار بار دہرائی جائیں تو ان کی نامعقولیت میں کمی آجاتی ہے بلکہ وہ عاقلانہ رُوپ دھار لیتی ہیں۔ ہندوستان کے اونچی ذات والے اس نفسیاتی کشمکش کے اُستاد ہیں بلکہ اس فن میں پوری دنیا کے امام بن بیٹھے ہیں۔ "ہندوستان کی لعنت" برہمنیت صرف اس قسم کے جھوٹ اور جھوٹے پروپیگنڈہ کے بھروسے زندہ ہے۔ تاریخ کو مسخ کرنا اس سلسلے میں دماغ بدلی (BRAIN WASHING) کا ایک جز ہے۔

اس میدان میں ان کی مہارت اتنی ترقی کر چکی ہے کہ رام جیسی غیر موجود شخصیت نہ صرف یہ کہ ایک حقیقت بن چکی ہے بلکہ خدائی عظمت سے منوّر کر دی گئی ہے۔ کرشن کی شہوانی مہمات معزز قرار دے دی گئی ہیں اور ایک عظیم اور دلیر دلیت عالم راون راکشس اور ملعون بنا دیا گیا ہے۔

حالیہ سالوں میں برہمن پروپیگنڈا نے علم و فن کے مربّی محمود غزنوی کو ایک قابلِ نفرت شخصیت بنا رکھا ہے۔ یہاں تک کہ مسلمان بھی اس بات کو صحیح سمجھتے ہیں۔ بابا صاحب امبیڈکر نے برہمنیت پر لعنت بھیجی اور اس کو مٹانے کی کوشش کی۔ اچھوتوں پسماندہ ذاتوں اور عورتوں کو ہندو مت کے کشتے قرار دیا۔ بالآخر ہندو مت کو دھتکارتے ہوئے بدھ مت اختیار کیا۔ لیکن آج ان کو ہندو مت کا مُصلح کہا جا رہا ہے۔ جھوٹ ننانوے بار دُہرایئے اور وہ سوّیں مرتبہ الہامی سچ بن جاتا ہے۔ یہی رویّہ سترھویں صدی کی ایک اور عظیم شخصیت اورنگ زیب کے بارے میں

بھی اختیار کیا جا رہا ہے اور وہ نفرت کا عنوان بنائے جا رہے ہیں ۔

نازی پروپگنڈا کے یہ علمبردار ہندوستان کے انگریز حکمرانوں کو بھی مجرم بنا کر پیش کر رہے ہیں اور ان کے تمام تاریخی انعامات کو چھپا رہے ہیں ۔ ہندوستان کی یہ نام نہاد جمہوریت جس پر ان کو اتنا گھمنڈ ہے، وہ انہی انگریز حکمرانوں کی دین ہے ۔ اس کو موجودہ اور آئندہ آنے والی نسلوں سے کھلی طور پر چھپایا جا رہا ہے ۔ صرف پچاس برس پہلے یہی اونچی ذات والے انگریزی حکمرانوں کی تعریف اور خوشامد کرتے تھے اور پوری وفاداری سے ان کی خدمت کرتے رہے ۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے نام نہاد عظیم وطن پرست رابندر ناتھ ٹیگور نے انگریز شہنشاہ کی تعریف میں وہ نظم لکھی جو بعد میں ہندوستان کا "قومی ترانہ" بنالی گئی ۔

ان کے ہاتھوں موجود اخبارات یعنی میڈیا کے ذریعہ یہ چرچا ایسی باقاعدگی کے ساتھ کیا جا رہا ہے کہ بابر اور اورنگ زیب جیسے نیک اور سیکولر مسلم حکمرانوں کو فرقہ پرست اور بت شکن قرار دے کر انہی گری ہوئی نظروں سے دیکھا جا رہا ہے ۔ اس پرچار کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کتنے ہی مسلمان دانشور اپنی قابلِ قدر تاریخی شخصیتوں کے بارے میں معذرت کرتے نظر آتے ہیں ورنہ حقیقت میں انہیں فخر کرنا چاہئے تھا اور یہی ہے وہ بات جو ہندو نازی چاہتے ہیں ۔ یہ چاہتے ہیں کہ ہر مسلمان ہر عظیم مسلمان سے ایسی ہی نفرت کرے جیسے ناواقف دلیت، راون سے کرتے ہیں جو ایک عظیم دلیت تھے ۔

لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ جملہ انتظامی طریقے، تعلیمی ماحول، قانونی روایات، جمہوری اصول اور سیکولر نظریات جن پہ ہم آج قائم ہیں انگریزی حکومت کی ہی دین ہیں ۔ ایک عظیم وطن پرست نے کہا ہے کہ یہ خدائی عطیہ تھا کہ ہندوستان انگریزوں سے اتنا قریب آگیا ۔ یہ انگریز (عیسائی) تھے جنہوں نے

اونچی ذات والے لیڈروں کو وطنیت کا درس دیا اور انگریزوں سے لڑنے پر انہیں اُکسایا۔ ہندوستان کی حکمران پارٹی انڈین نیشنل کانگریس کا بانی بھی ایک انگریز ہی تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ٹھوس حقیقتوں کو چھپایا جا رہا ہے۔ تاریخ کو ایسے مفسدانہ طریقے سے مروڑا جا رہا ہے اور شخصیتوں کو ایسا بدنام کیا جا رہا ہے کہ ہمیں شک ہونے لگا ہے کہ شاید میڈیا جہالت اور تنگ نظری کو بڑھاوا دے رہا ہے نہ کہ عقل اور اتحاد کو۔

جب اورنگ زیب کے مندروں کو دئے گئے عطیہ جات یا برہمن پجاریوں اور رام اور کرشن کے بارے میں سوامی وِویکانند کے نظریات، یا موجودہ قومی ترانے کے بارے میں جو ٹیگور نے انگریز شہنشاہ کی تعریف میں لکھا تھا، عوام کو بتایا جاتا ہے تو واقف کار ناخوش ہوتے اور تعجب کا اظہار کرتے ہیں۔

سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کی جانے والی اس تاریخ کے توڑ مروڑ کے سلسلے میں بابری مسجد کا قضیہ کوئی تنہا واقعہ نہیں ہے۔ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے کارناموں کو غلط روپ میں پیش کرنے کی ایک باقاعدہ مُہم ایک بڑے منصوبے کا حصہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت ساری مسجدوں، درگاہوں، عیدگاہوں، قلعوں، یادگاروں، محلوں کے ساتھ اس کو جوڑا جا رہا ہے۔ جعل سازی! تیرا نام آریہ مت ہے۔

اس لئے ہر ہندوستانی صاحب علم کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ ایسے جھوٹے مطالبوں کو رد کرے اور حقیقی معاملات کو پیش کرے۔ پی ایس سرید ھر مورتی کی یہ عالمانہ کتاب اس سلسلے میں ایسی ہی ایک کوشش ہے۔ ہم حق کے ہر متلاشی کو اس کی طرف راغب کراتے ہیں۔

وی۔ٹی۔ راج شیکھر

یکم اپریل 1988ء

تمہید

بابری مسجد کے تنازعے پر کچھ لوگوں نے اور کچھ نام نہاد عالموں نے عمداً غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ شہادتوں کو مٹایا اور غلط بتایا جا رہا ہے تاکہ ہندو نازیوں کے ہاتھ مضبوط ہو جائیں جن کا پکّا ارادہ ہے کہ بابری مسجد کی مسلمانوں کو بازیابی نہ ہو۔ لیکن شکر ہے کہ چند سیکولر ذہن رکھنے والے دانشور چوکنّا ہوئے ہیں اور یہ جانچنا شروع کیا ہے کہ تاریخ کے نام پر لکھی جانے والی کچھ کتابیں کہاں تک سچی ہیں۔ تین کمار سنیال، یس دھان سنگھ زور آور، عارف دشنوی اور مسز سریندر کور نے شیر سنگھ آئی اے یس کی قیادت میں ایک جماعت بنائی اور بابر کے خلاف لگائے گئے ان فضول الزامات کی جانچ پڑتال شروع کی جو یہ بتانے کے لئے تیار کئے گئے تھے کہ بابر نے ایودھیا میں موجودہ بابری مسجد کی تعمیر کے لئے رام مندر کو توڑا تھا۔

اس تحقیق سے جو نتیجہ نکلا وہ ایک مستند اور انتہائی خوبیوں والی کتاب کے روپ میں شائع ہُوا جس کا نام ہے
The secular Emperor Babar — was Babar an iconoclast?
("سیکولر شہنشاہ بابر — کیا بابر بُت شکن تھا؟")
اس کی اشاعت اپریل 1987 میں ہوئی۔ اس کا پیش لفظ اڑیسہ کے گورنر بی۔ین۔ پانڈے صاحب نے لکھا اور تمہید علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سنٹر فار اڈوانسڈ سٹڈیز کے ڈاکٹر اشتیاق حسین ظلی نے لکھی۔ آپ نے اس کو ایک صحیح معنوں میں تحقیق کہا ہے۔ اس کتاب کو ہریش جین

لوک گیت پرکاشن نمبر 29 سرہند پنجاب 406 140 نے شائع کیا۔
اِس کتاب کا بہت سا مواد اسی کتاب سے لیا گیا ہے۔ اس جماعت کے
ایک رکن تپن سنیال نے ایودھیا کا عینی جائزہ کرنے کے بعد اپنے تاثرات
یں کہا ہے "ایک بنگالی برہمن ہونے کے ناطے میں پہلے پہل اس
کتاب میں بیان کی گئی باتوں پر یقین کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ فرقہ واریت،
سیکولر جذبات پر بہت تیزی سے حاوی ہوتی جا رہی ہے۔ میں بھی کبھی اسی
قسم کے اکثریتی طبقہ سے متعلق تھا جو مذہبی طور پر کٹر فرقہ پرست بتائے
جاتے ہیں۔ میں اور شیر سنگھ نے ۱۹۸۶ء کی گرمیوں میں اس ٹھوس مقصد
سے تحقیقات شروع کر دی کہ بابر کے اُس دور اور ایودھیا کی بابری مسجد کے
بارے میں حقیقت معلوم ہوسکے۔ ایودھیا میں ہم عالمگیر مسجد، شاہجہانی مسجد
اور دوسرے بہت سارے مقدس مقامات دیکھ آئے۔ ہم نے ہندوؤں کے
مندر ہنومان گڑھی، ناگیشور ناتھ، رام جنم ستھان، پڈو کا بھون، باراہی
مندر وغیرہ دیکھے۔ ایک خوبصورت جین مندر اور ایک گردوارہ دیکھا۔
ایودھیا ہندومت، اسلام، سکھ مت اور جین مت، چاروں مذہبوں کا
سنگم ہے۔

"میں نے بابری مسجد کو شہر کے ایک آخری کنارے پر دیکھا۔ یہ ماننے
کے لئے کوئی جواز نہیں ہے کہ یہ مسجد کسی قدیم مندر کی جگہ یا کسی قدیم
عمارت کے ملبے پر بنائی گئی ہے۔ یہ مسلمانوں کی ہی ہوسکتی ہے"!

آخر میں یہ کہتے ہیں۔ "یہ مسجد ایک قومی ورثہ ہے۔ ایک تاریخی
یادگار اور سب سے زیادہ اسلامی عبادت گاہ ہے۔ یہ بڑے شرم کی
بات ہے کہ ایک اقلیتی فرقہ جو ایک عظیم تہذیب کا حصہ دار ہے جو اس
ملک اور اس کے تمدّن کا ایک معمار ہے، آج نسلی نفرت کے اٹھتے ہوئے

طوفان کا شکار ہے جو اس کے عظیم آبا و اجداد کے خلاف اٹھ رہا ہے۔"
(سیکولر ایمپرر بابر صفحہ ۹۸ تا ۱۰۰)

عدالتوں کے مقدمے اور گلیوں کی جنگیں

واضح رہے کہ وہ الزامات جن کی بنیاد پر بابری مسجد پر ہندو نازیوں کے مطالبے منحصر ہیں ان کی بنیاد نفرت پر ہے۔ اور ان کو تاریخ سے کوئی تعاون نہیں ملتا۔ چند مسلم دانشور جو مصالحت اور مفاہمتِ باہمی کی رائے پیش کر رہے ہیں تاریخ سے واقف نہیں ہیں اور نہ ہی ان مقاصد سے جو نازیوں کے مطالبے کے پیچھے پوشیدہ ہیں۔ نہ تاریخ ان کی مدد کر سکتی ہے اور نہ ہی داستانیں۔ ان کے ارادے صرف بابری مسجد تک محدود نہیں ہیں۔ اگر یہ مسلمانوں سے بابری مسجد چھیننے میں کامیاب ہو گئے تو ان کے لئے یہ ایک نظیر بن جائے گی اور اُن کے احتجاج مسلمانوں کے ہر اہم مقام پر پہنچ جائیں گے جس میں مکۂ مکرمہ کا خانۂ کعبہ بھی شامل ہوگا۔ اس نظریہ کو یاد رکھئے کہ تاج محل ایک شیو مندر ہے۔ اپریل 1982 کولمبو کی ورلڈ ہندو کانفرنس میں ایک پیپر پیش کیا گیا تھا جس میں یہ دعوا کیا گیا تھا کہ "خانۂ کعبہ کا حجرِ اسود شیولنگ کا ایک رُوپ ہے۔" نازی پروازِ تخیل کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

فیض آباد ضلع گزیٹر 1905 کے مطابق "کہا جاتا ہے کہ اس وقت (1855) تک دونوں ہندو اور مسلمان اسی عمارت میں عبادت کرتے تھے۔ لیکن غدر (1857) کے بعد مسجد کے سامنے ایک بیرونی احاطہ بنا دیا گیا

ہے اور ہندوؤں کے اندرونِ صحن داخلہ پر پابندی لگا کر باہر کی طرف پوجا پاٹ کے لئے ایک چبوترہ بنا دیا گیا ہے"۔

1883ء میں ہندوؤں کے نازی طبقے اس چبوترے پر مندر بنانا چاہتے تھے لیکن ڈپٹی کمشنر نے 19 جون 1885 کے دن اس پر روک لگا دی۔ ایک مہنت رگھوبیر داس نے فیض آباد کے سب جج پنڈت ہری کرشن کے روبرو دعویٰ دائر کیا جس میں 17 فیٹ × 21 فیٹ چبوترے پر مندر بنانے کی اجازت طلب کی گئی۔ دعویٰ خارج کر دیا گیا۔ فیض آباد ڈسٹرکٹ جج کرنل جے ای اے چیمبر کے روبرو اپیل کی گئی۔ جنہوں نے اس مقام کا 17 مارچ 1886 کو بہ نفسِ نفیس معائنہ کیا اور اپیل رد کر دی۔

پھر اودھ کے جوڈیشل کمشنر ڈبلیو ینگ کے روبرو 25 مئی 1886ء دوسری اپیل پیش کی گئی۔ انہوں نے بھی اپیل مسترد کر دی۔ اس کے ساتھ ہندو نازیوں کی عدالتی جنگ کا پہلا دور ختم ہوا۔

1934ء کے "فرقہ وارانہ فساد" کے دوران مسجد کے اطراف کی دیواروں اور گنبد کو نقصان پہنچا۔ انگریزی سرکار نے اس کی مرمت کروا دی۔

22 دسمبر 1949ء کی اُتر پردیش کی ایک انتہائی سرد رات کے پچھلے پہر جبکہ پولیس کے محافظ سو رہے تھے رام اور سیتا کے بت انتہائی رازداری سے مسجد کے اندر چوری چھپے پہنچوا دئے گئے اور ہندو نازیوں کی ایک جماعت کے ہاتھوں گڑوا دئے گئے۔ اس کی رپورٹ کانسٹبل ماتا پرشاد نے دوسری صبح دی جو ایودھیا کے پولس اسٹیشن میں درج کی گئی۔

پہلے سے تیار کئے گئے منصوبے کے تحت دوسری صبح (23 دسمبر 1949) ایک بہت بڑے "ہندو" ہجوم نے ان بُتوں کی پوجا کے لئے مسجد میں داخل ہونے کی "جرأتمندانہ کوشش" کی۔ ضلع مجسٹریٹ کے۔ کے۔ نیّر نے ریکارڈ کیا ہے کہ "ہجوم نے زبردستی اندر داخل ہونے کی انتہائی زوردار کوشش کی۔ تالا توڑ دیا گیا اور پولس کے پیر اُکھڑ گئے۔ ہم سب افسروں اور جوانوں نے بڑی مشکل سے ہجوم کو پیچھے دھکیلا اور دروازے پر قبضہ کر سکے۔ سادھو بے جگری سے جوانوں اور ہتھیاروں پر ٹوٹ پڑے، بڑی دِقّت سے ہم دروازے پر جمے رہے۔ دروازے پر قابض ہونے کے بعد ایک مضبوط تالا لگا کر صحن مقفّل کیا گیا۔ اور پولس کی تعداد بڑھا دی گئی۔ (شام 5 بجے)

اس طرح ہندو نازیوں کی یہ مہم ناکام ہو گئی۔ اس دہشت ناک خبر کو سُن کر وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو بے انتہا خفا ہوئے اور یوپی کے چیف منسٹر گووند ولبھ پنت کو ہدایت بھیجی کہ بُت نکال دئے جائیں۔ پنت کے حکم پر چیف سکریٹری بھگوان سہائے اور انسپکٹر جنرل آف پولس بی وی لاہری نے سخت ہدایتیں فیض آباد بھیجیں کہ بُت نکال دئے جائیں۔ تاہم کے۔ کے۔ نیّر کو خوف ہوا کہ ہندو ہجوم "خون ریزی اور قتل و غارت گری" شروع کر دے گا۔ اس لئے احکامات کی تعمیل پر اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ اس وقت سے ہندو نازیوں کو تشدّد اور بلوے پر بھروسہ ہو چلا ہے۔

کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ ہندو نازی اپنے مقاصد کے حصول کے لئے "خون ریزی اور قتل" پر یقین رکھتے ہیں؟

<u>5 جنوری 1950</u> : فیض آباد و ایودھیا میونسپل بورڈ کے چیرمین کو قانونِ فوجداری کی دفعہ 145 کے تحت مسجد کا رسیور مقرر کیا گیا۔

16/ جنوری 1950 : گوپال سنگھ وِشارَد نے فیض آباد سِول جج کے روبرو سِول مقدمہ (No. 2 of 1950) دائر کیا کہ بتوں کی پوجا کی اجازت دی جائے جو غیر قانونی طور پر مسجد میں رکھے گئے تھے ۔ یہ مقدمہ اب تک ختم نہیں ہُوا اور اب معاملہ ہائی کورٹ میں پڑا ہُوا ہے ۔ اس مقدمہ میں آٹھ مدعا علیہ ہیں جن میں پانچ مسلمان اور حکومتِ یوپی شامل ہے ۔ ڈپٹی کمشنر جے این اُگرا کا عدالت کے سامنے دیا گیا بیان ہے : " 22/ دسمبر 1949 کی شب رامچندر جی کے بُت چوری چھپی غلط طور سے اس (مسجد) کے اندر ڈال دیے گئے "۔

25 جنوری 1986 کو اٹھائیس سالہ اُمیش چندر پانڈے جو مقدمے کے دائر کئے جانے والے دن پیدا تک نہیں ہُوا تھا عدالت میں حاضر ہوتا ہے اور خود اپنے اور اس کے ہم مذہبوں کی جانب سے مسجد کے اندر بُتوں کی پوجا کی اجازت چاہتا ہے اور ضلع جج کے یم پانڈے ضلع مجسٹریٹ (روینیو افسر) ٹی کے پانڈے کا بیان ریکارڈ کرتا ہے اور مقدمے کی دوسری پارٹیوں کو اپنے اعتراضات پیش کرنے کا موقع تک نہ دیتے ہوئے ایک درمیانی حکم کے ذریعے عرضی دار کو پوجا کی اجازت دے دیتا ہے ۔ کمال یہ کہ حکم دیتے وقت کیس کا اصلی فائل ضلع جج کے روبرو موجود تک نہیں تھا ۔

اس حکم کے سنائے جانے کے چند منٹوں کے اندر 37 برس پہلے (23 دسمبر 1949) ڈالے گئے تالے توڑ دیے گئے اور پوجا شروع ہو گئی ۔

حقیقت صاف ہے کہ وی سی پانڈے ، کے یم پانڈے اور ٹی کے پانڈے سب کے سب ایک ہی فرقے کے ذیلی فرقے سے متعلق ہیں جیسا کہ ان کے ناموں ہی سے ظاہر ہوتا ہے ۔

اور عجیب تربات تو یہ ہے کہ حکومت کا اپنا ٹی وی اس دن کے تالے

کھولنے، پوجا کرنے اور ہجوم کی خوشیاں منانے کے مناظر ٹی وی پر دکھانے میں کوئی دیر نہیں لگاتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹی وی والوں کو عدالت کے حکم کا علم پہلے سے ہی رہا ہوگا۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ میڈیا نازیوں کے زیرِ اثر ہے۔

اونچے ذاتیوں کے قبضے میں موجود "قومی پریس" نے بابری مسجد رام جنم بھومی کے اصل واقعات کو پیش کرتے وقت اوپر بتائی گئی حقیقتوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ میڈیا صرف نازی نقطۂ نظر کو ہی اُجاگر کر رہا ہے۔

فی الحال وِشوا ہندو پریشد اور دوسرے نازی جلسے کر رہے ہیں، جہاں عہدنامے لئے جا رہے ہیں کہ مسلمانوں کو بابری مسجد نہیں دی جائے گی چاہے عدالت کا آخری فیصلہ کچھ بھی ہو جائے۔ کیا یہ وہی نازی ہیں جو ہمیشہ یہ دعویٰ کرتے رہتے ہیں کہ "ہندوستان کے لئے صرف ایک ہی اُمید بخش ہے جو عدالت ہے"۔ قانونی حکومت کی حمایت کرنے والے بابری مسجد کے معاملے میں قانون شکنی کر رہے ہیں۔

عدالتوں میں مقدمہ بازی کی اور زیادہ تفصیلات کے لئے دیکھیے یس کے ترپاٹھی کا لکھا مقالہ "معاملۂ بابری مسجد یا رام جنم بھومی"۔ (انڈین ایکسپریس بمبئی ایڈیشن ۳۰/ مارچ ۱۹۸۶ء) جس کو آل انڈیا مسلم یوتھ کنونشن (یوپی)، نمبر ۵۱ کچا احاطہ، امین آباد، لکھنؤ نے پھر سے چھپوا کر شائع کیا۔

بُدھ مت اور جین مت کی برہمنیت سے ٹکّر

ایودھیا کی تاریخ:

یم ونٹرنٹز۔ اے بی کیتھ اور دوسرے عالموں کی رائے ہے کہ والمیکی کی رامائن دوسری یا تیسری صدی قبلِ مسیح تصنیف کی گئی۔ یہ وہ دور تھا جبکہ پورا ملک بُدھ مت اور جین مت کے زیرِ اثر تھا جو ویدوں کی برتری کو مانتے نہیں تھے۔ دونوں احتجاجی (Protestant) مذہب تھے۔ اس زمانے میں مندر بنانے کا فن معلوم نہیں تھا۔ آچاریہ گنڈوجی شرما نے ایودھیا پر اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ راجہ پُشیا مترا (184 ق م تا 148 ق م) نے بُدھ راجہ مِنندر کے ساتھ لڑتے ہوئے ایودھیا کے ایک بہت بڑے بُدھ وِہار کو ڈھا دیا۔ (ایودھیا گائڈ۔ آچاریہ گنڈوجی شرما۔ صفحہ 69)

عالمی شہرت یافتہ آثارِ قدیمہ کے ماہر الکزنڈر کِننگھم کہتے ہیں کہ ایودھیا بدھیوں کی زیارت گاہ تھی اور یہ کہ بُدھ نے یہاں کافی عرصے تک قیام کیا تھا (Ancient geography of India P.401)

ڈاکٹر جیوتی پرشاد جین 1965 میں ملے ہوئے چند سکّوں اور دوسری یادگاروں کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ایودھیا قدیم زمانے سے جینیوں کا مقدس مقام تھا)

(Adhikirtha Ayodhya page 13)

قنوج کے یشوورمن کی موت کے بعد سے دسویں صدی عیسوی تک ایودھیا پر گرجار پرتھی ہارا خاندان کے جین راجاؤں کی حکومت تھی۔ دسویں اور گیارھویں صدی کے بہت سارے پتھروں پر کندہ جینی نقوش

اور سنگین ستون آج تک موجود ہیں۔ (ایضاً صفحہ 13)

1032 عیسوی میں محمود غزنوی کے بھانجے سید سالار غازی نے یہاں چڑھائی کی کوشش کی تو جین راجہ سریواستو نے حملہ ناکام کر دیا۔ گیارھویں اور بارھویں صدی میں جب پہلی مرتبہ مسلمان ایودھیا سے قریب ہوئے تو یہ شہر جینی شہر تھا۔

ڈاکٹر جیوتی پرشاد جین کہتے ہیں کہ 1330 (چودھویں صدی) میں جین آچاریہ پربھوسوری جینیوں کی ایک جماعت کے ساتھ سلطان محمد بن تغلق سے اجازت لے کر ایودھیا گئے۔ اس وقت یہاں بہت سارے جینی تعمیرات تھے۔ جیسے

١) رشی بھادیوا کے باپ راجہ نبھی رائے کا مندر
٢) پرشوا ناتھ کا مکان
٣) چکریشوری کا بُت
٤) گائے کے سر والے یکشا کا بُت
٥) سورگ دوار وغیرہ

ان کے علاوہ پانچ اور جینی مندر ایودھیا میں پیدا ہونے والے پانچ تیرتھنکاروں کے نام سے موسوم تھے۔ (ایضاً صفحہ 45)

یہ پانچوں تیرتھنکار مندر گرجارا پرتھی ہارا خاندان کے راجاؤں کے بنائے ہوئے تھے۔ مہیر پرتھی ہارا ایسا ہی ایک راجہ تھا۔

رام: ویدوں کے مذہب کا محافظ

یہ رامانوجہ کے معتقد رامانند تھے جنھوں نے شمالی ہندوستان میں ویشنوازم کو پھیلایا۔ ان کے معتقدوں کو رامندی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے

رام کی پوجا کی تحریک چودھویں اور پندرھویں صدی میں چلائی اور ویشنو ازم کو پھیلایا۔ جب جین مت زوال پذیر ہوا۔ "رام کی پوجا کی تحریک سترھویں صدی کے شروعات میں تلسی داس کی لکھی ہوئی رام چرت مانس کی تصنیف کے بعد مضبوط ہوگئی اور ایودھیا رام کی پوجا کا مرکز بن گیا۔ (ایضاً صفحہ ۲۱) بابر کے پوتے اکبر کا فراخ دل دورِ حکومت رام اور کرشن کی پوجا کے پھیلانے میں بہت مددگار ثابت ہوا۔ اس پُرامن دور نے ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا کہ ہر شخص کو اپنے خیالات کے اظہار کی آزادی تھی۔ بکروں کی قربانی دینے والے اور گوشت خور راجپوتوں کے درمیان سبزی خوری کے پرچار کا موقع میرا بائی کو اسی دور میں مل سکا۔ اور صرف ایک ہی غیر آریہ ہندوستانی خدا شیوا کی پوجا کرنے والے راجپوتوں کے درمیان میرا بائی سے کرشن بھگتی کے پرچار کا کام ہو سکا۔ بہت سارے مندر اور مٹھ تعمیر ہو سکے۔ جینیوں کی نشانیاں مٹنے لگیں۔ اور آج یہ صرف جینیوں کی زیارت گاہ بن کر رہ گئی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۱)

اور ایک ایسے وقت میں جبکہ بدھ مت اور جین مت اپنے عروج پر تھے تو ویدی مذہب کو ماننے رہنے والوں نے محسوس کیا کہ برہمنوں کی بالادستی سے تنگ آ کر ویدی روایات کو ترک کر کے بدھ مت اور جین مت کے آغوش میں پناہ لئے ہوئے عوام کے جذبات اور آرزوؤں کو جب تک مطمئن نہیں کیا جائے گا اور پھر سے انہیں ویدی روایات کے اندر نہیں کھینچ لیا جائے گا ویدی مذہب پنپ نہیں سکتا۔ مایوسی کے اس عالم میں وہ ایک غیر برہمن صورت، ایک پُرکشش مرکز، ایک منظورِ نظر بُت کی تلاش میں لگ گئے جس میں کچھ مخصوص خوبیاں ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ویدی روایات اور پجاریوں کا خدمت گزار بھی ہو۔ انتہائی مایوسی کے عالم میں

وہ ایک افسانوی ہیرو کی تلاش میں لگے رہے جو غیر برہمن عوام کو اپنی طرف مائل کر سکتا ہو اور دکھا سکتا ہو کہ کس طرح ویدی روایات، مخصوص خوبیاں رکھنے والے چھوٹے سے انسان کی بھی عزت افزائی اور عبادت کر سکتے ہیں۔ رام کی تصویر۔ کردار اور شخصیت بخوبی اس ضرورت کو پورا کرنے کے قابل تھی۔ اس لئے اس خلا کو پُر کرنے کے لئے رام کو تیار کیا گیا۔ اسی لئے والمیکی۔ رام اور وِشوامترا کو غیر برہمن ہونا پڑا۔

یہ تسلیم کرنے میں بڑی مشکل ہے کہ ایک شکاری اچانک اتنا بڑا شاعر بن جاتا ہے کہ ایک شاہنامہ لکھ دے۔ شاید ویدک برہمنوں نے یہ واقعہ گھڑ دیا ہے کہ شکاری سے ولی بننے والے نے شاہنامہ لکھا۔ لیکن محض ایک شکاری کو چاہے وہ کتنا بھی سدھر جائے کیا اتنے بڑے کارنامے کا اعزاز دیا جا سکتا ہے؟ ڈاکٹر سمیتی کمار چٹرجی کے مطابق چیاون مہارشی نے اول رامائن لکھی اور والمیکی نے اس کو ایڈٹ کیا اور سدھارا۔

والمیکی کی کتاب میں رام کو خدا کے اوتار کے روپ میں پیش نہیں کیا گیا ہے۔ (یہ بعد کی دی ہوئی امیج ہے) انہیں عوام پر یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ ویدی مذہب کے اندر برہمنوں اور عالموں کو بھی مجرم ثابت ہونے کے بعد معاف نہیں کیا جاتا اور انہیں دشمن اور راکشس کہا جاتا ہے۔ اسی لئے راون کو ایک برہمن اور عالم کے روپ میں پیش کرنا ضروری تھا۔

ایک بنگالی کتاب لوکا وتھر اُسترا میں راون کو دراوڑی بادشاہ بتایا گیا ہے جس نے بدھ مت اختیار کر لیا تھا۔ اور اس کو افلاطون اور ارسطو کی طرح فلسفی بتایا گیا ہے۔

(Ramayana – A True Reading
E.V. Ramaswamy)

اے ونٹرنٹز کے مطابق چوتھی صدی قبلِ مسیح میں لکھی گئی بدھیوں کی کتاب سدھارما لنکاوترا سترا (جس کا ترجمہ چینی زبان میں سن 443 میں ہوا ہے) میں بدھ اور راون کی ملاقات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔
(The legacy of the Ramayana:
G.S. Ghurye P 265)

ویدی روایات اور بدھ مت کی لڑائیوں کے ضمن میں راون کی بدھ مت کے ساتھ ہمدردی یا جھکاؤ نے برہمنوں کو اس بات پر اکسایا ہوگا کہ راون کو ایک ظالم دیو کے روپ میں پیش کیا جائے۔ ٹالبائی وھیلر نے یہ لکھ کر بہت کچھ کہہ دیا ہے کہ "رام کا افسانہ ہندومت کی بدھ مت پر فتح کا اظہار ہے"۔ آلبرشٹ ویبر نے اپنی کتاب ۔ ۔ ۔ ۔ (On Ramayana 1873) میں وھیلر کا حوالہ دیا ہے۔

رام کے پاس ہمیشہ ایک کمان اور تیروں کا پلندہ ہوتا تھا۔ جس سے تشدد کا جواز ملتا ہے، جو اہمسا کے خلاف ہے اور اہمسا وہ اصول ہے جس کی تلقین بدھ مت اور جین مت کرتے ہیں۔ رام گوشت خور اور شراب نوش تھے جبکہ جین مت پہلا مذہب تھا، جس نے سخت قسم کی سبزی خوری کی تلقین کی۔ اپنی تمام زندگی میں رام نے اپنی قوت اور تیراندازی کی صلاحیت کو یگیوں کی محافظت اور حمایت میں صرف کیا جبکہ بدھ نے کرما کنڈا اور منتروں کی تضحیک کی تھی۔ یگناؤں میں گوشت کے پکوان اور نشیلی شرابوں کو بڑی اہمیت تھی۔ اسوا میدھا یاگا میں گھوڑے کا گوشت پکوایا اور کھلایا جاتا۔ رگ وید سوم رس (شراب) کی بہت مقامات پر تعریف کرتی ہے۔ رگ وید کا نواں منڈل سوما یگنا کی حمایت میں بھرا پڑا ہے۔ سوترامنی یگنہ کے عظیم رسم میں صرف شراب ہی استعمال

ہوسکتی تھی۔ سوما ولی نامی پودا جس کا رس سوم رس کی تیاری میں ایک اہم عنصر ہے۔ اس کے اٹھارہ نام ہیں جیسے امرت (لافانی) اننت (ناختم ہونے والا) جیونتی (زندگی سے بھرا ہوا) دیوا بزیتا (خدا کا ہی بنایا ہوا) بزجرا (ہمیشہ جوان) مادھوکا (شیریں) وغیرہ۔
گائے کا گوشت بھی ویدی دور میں بہت مرغوب تھا۔*

ہمیں بدھ اور مہاویر کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ جنہوں نے بے زبان جانوروں پر رحم کھانے کی ہم کو تعلیم دی۔ گائے کا گوشت اور شراب یگنوں کے دوران خداؤں کو نیویدیا (تحفہ جات) کے روپ میں دیئے جاتے تھے اور رام کی تمام فوجی صلاحیت یگنوں کے تحفظ کے لئے استعمال ہوئی۔ قابلِ غور جملہ: رام ہر اس چیز کے بالکل خلاف تھے جس پر بدھ اور مہاویر قائم تھے۔ ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کہتے ہیں کہ رام کو خدا نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ ان میں صرف انسانی صفات تھیں۔
(Riddles of Rama and Krishna D.S.A 1987)

رام کا رنگ کالا (یا نیلا) تھا جو آریوں کے گورے رنگ کی ضد تھا۔ یہ افسانہ ظاہر کرتا ہے کہ آریائی ویدی مذہب میں غیر برہمن بھی عزت کے اعلیٰ مقامات پر پہنچ سکتے ہیں۔ ویدی مذہب کی سیاسی ابن الوقتی

---

* ویدک دور میں پجاریوں کے ہر قسم کے جانوروں کے گوشت کھانے کی تفصیلات دیکھیے The quintessence of the Rigveda 1964, by C. Kunhan Raja جو سنسکرت کے ماہر ہیں جنہوں نے سنسکرت روایتی طور پر سیکھی اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ حاصل کی۔

کو اپنے تحفظ اور عوام کو غیر ویدی بدھ مت اور جین مت سے اپنی طرف کھینچنے کے لیئے اس قسم کے پرچے کی ضرورت تھی۔

پیری یار رام سوامی اور جواہر لال نہرو جیسی جذبات سے دور ہوکر انصاف سے سوچنے والی اور ایک دوسرے سے دور رہنے والی اور بہت زیادہ اختلاف رکھنے والی شخصیتوں نے بتایا ہے کہ رامائن الگ الگ تمدنوں اور تہذیبوں کے مابین ٹکراؤ اور جدوجہد کی نمائندہ ہے۔

(تلاش ہند۔ جواہر لعل نہرو۔ صفحہ 62 اور 82)

راون ایک مہربان حکمران تھے اور عالم بھی۔ جیساکہ خود والمیکی نے بتایا ہے۔ لیکن چونکہ راون نے بیگناؤں اور نشیلے سوم رس کی تضحیک کرتے ہوئے ویدی پجاری طبقے پر حملہ کیا تو ان کو ملعون (راکھشس) کہا گیا۔

رام کا طور طریقہ بدھ کے طور طریقے کی بالکل ضد تھا۔ بدھ نے اپنی رانی اور بچے کو چھوڑ دیا۔ تخت کو ٹھکرا دیا اور بیابان چلے گئے۔ رام نے اپنی رانی سیتا کو دھوکے سے دھتکار دینے کا بہانہ تلاش کر لیا۔ (یعنے یہ بتائے بغیر کہ وہ دھتکار دی جا رہی ہیں) یہ جانتے ہوئے کہ وہ حاملہ ہیں۔ وہ خود محل میں رہے اور تخت کو سنبھالے رکھا۔

ویدی مذہب نے رامائن کا سلسلہ وار قصہ گھڑ لیا۔ لوگوں کو یہ بتانے کے لیئے کہ بدھ کا طور طریقہ سراسر غلط تھا۔

راون کو بیک وقت راجہ (شتری)، عالم (دس عالموں کے برابر یعنے دس سر والا)، راکھشس، برہمن اور دراوڑی بتایا گیا ہے۔ یہ تمام صفات ایک ہی وقت میں مناسب معلوم نہیں ہوتے۔

بہت ممکن ہے کہ وہ ایک ذی علم برہمن ہو جس نے جنوبی علاقے پر حکومت کی اور بدھ مذہب کے زیر اثر ویدک مذہب سے بغاوت کا مرتکب

ہُوا۔ اس طرح ویدک مذہب کے معذرت خواہوں کے ہاتھوں راکھشس اور دراوڑی کہلایا گیا۔

رام : کیا تاریخی ہستی تھے

ڈاکٹر سُکمار سین نے اپنی "رام کے قصے کی ابتدا اور انتہا" (origin and development of Rama legend) میں کہا ہے کہ رام کے حالات تریتا یُگ میں نو لاکھ برس پہلے واقع ہُوئے۔ ڈاکٹر شُکل کہتے ہیں کہ پُرانوں میں دئے گئے اِکشِں واکُو کے شجرے کی بنیاد پر رام کے زمانے کا حساب کیا گیا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو رام کو چار ہزار برس پہلے زندہ رہنا چاہئے تھا۔ (یعنے 2350 ق م سے 1950 ق م تک)۔ ایودھیا میں آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کے مطابق "یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جنم بھومی کے علاقہ پر پہلا قبضہ ساتویں صدی قبلِ مسیح میں ہُوا"۔ (Indian Archeology — A Review - 1976-77)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فیض آباد ضلع میں ایودھیا تین ہزار سال سے کم پُرانا ہے۔ ایودھیا کے معنی ہیں " ناقابلِ شکست "۔ آج کے ایودھیا میں ناقابلِ شکست ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔

سنسکرت کے مشہور گرامر نویس پانینی نے اپنی تحریر میں پانڈوں کے بڑے بھائی یدھشٹر، ارجن اور واسو دیو کرشن کا ذکر کیا ہے۔ لیکن رام کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ مارِٹس وِنٹر ہنٹز کے مطابق (A History of Indian literature VOL. II) رام کا ذکر عیسوی دور سے

قبل کی کسی تحریر میں نہیں ملتا۔

قومی پروفیسر آنجہانی سنیتی کمار چٹرجی کہتے ہیں۔ "راماین بنیادی طور پر ایک شاعر کی ادبی تخلیق ہے، جس کو والمیکی کا نام دے دیا گیا ہے۔ اس کی سطح کے نیچے کوئی تاریخی حقیقت نہیں ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کا کوئی بھی عالم یہ خیال نہیں کرتا کہ راماین کا ہیرو رام ایک تاریخی شخص تھا جس کو کسی مخصوص زمانے کے ساتھ جوڑا جا سکے۔"

چھٹی صدی کے امر سمہا کی سنسکرت دیوتاؤں کی فہرست "امر کوش" میں رام کو دیوتاؤں میں شمار نہیں کیا گیا ہے۔

شری لکشمی دھارا کی تیرتھ ووچنی کلپ میں گیارھویں صدی کے ہندو مقدس مقامات کی تفصیل دی گئی ہے۔ اس میں نہ ایودھیا کا ذکر ہے اور نہ رام جنم ستھان کا۔ رام کو دیوتا کی حیثیت سے رامانجاچاریہ کے مقلد رامانند نے پھیلایا اور تلسی داس نے ایودھیا کو شہرت دی۔

مندروں پر سب سے پہلا تذکرہ چینی سیاح ہوین سانگ کی تحریروں میں ملتا ہے جو ہندوستان میں 629 عیسوی سے 642 عیسوی تک رہا۔ اس نے ایودھیا کا "اتو یُو تو" کے نام سے ذکر کیا ہے۔ اور کہتا ہے کہ "اس میں تقریباً 100 سنگھرام اور 3000 پجاری ہیں اور یہاں 10 دیوتاؤں کے مندر ہیں۔" اس میں نہ تو کسی رام مندر کا ذکر کیا ہے اور نہ ہی جنم ستھان کا نام لیا ہے۔

رام کی تاریخی حیثیت کے بارے میں زیادہ دلچسپی رکھنے والوں کو جن تین کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے وہ ہیں: (۱) سُنیتی کمار چٹرجی کی راماین (۲) سُکمار سین کی رام کے قصّے کی ابتداء اور ارتقاء (origin and development of Rama legend)

اور (۳) پروفیسر آلبرشت ویبر کی "On Ramayana" ۔

ناسک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہیں رام نے راون کی بہن سورپانکھی کی ناک کاٹ ڈالی تھی۔ آندھرا پردیش کے وینوکونڈا (وینو تلگو میں بمعنی سُننا اور کونڈا پہاڑی) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہیں پہلی بار رام نے یہ بات سُنی کہ سیتا کا راون نے اغوا کیا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ والمیکی کی قیام گاہ کرناٹک کے کولار شہر کے قریب آونی میں تھی جہاں لَو اور کُش پیدا ہوئے۔ اور بھی بہت سارے مقامات ایسے ہیں جن کو مقامی روایات راماین کے کسی نہ کسی واقعے سے متعلق بتاتی ہیں۔ اس طرح ہندو ہندوستان میں افسانہ حقیقت بن جاتا ہے اور حقیقت دم توڑ دیتی ہے۔

نارلا ونکٹیشور راؤ کی راماین پر تلگو میں تنقید اور تحقیق "سیتا جوسیم" جس کو 1981 میں مرکزی ساہتیہ اوارڈ ملا ہے ایسی کتاب ہے جس کا مطالعہ ہر اُس شخص کے لئے ضروری ہے جو رامائن کا صحیح تجزیہ کرنا چاہتا ہو۔ میسور یونیورسٹی کے ڈاکٹر مسز ایچ یس سجاتا نے اس کا کنڑا ترجمہ "سیتا کا مستقبل" کے نام سے کیا ہے جس کا انگریزی ترجمہ مصنف کر رہا ہے۔

نارلا کے مطابق اگر رامائن میں کچھ تاریخی حقیقت ہے تو بس اتنی ہے کہ دسویں صدی قبلِ مسیح کے شمالی ہند کی بے شمار چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں سے ایک کی محلاتی جھگڑوں کی حد تک ہی ہے۔ اس کے اندر بڑھا چڑھا کر شاندار اور صوفیانہ طور پر بتائی گئی رام اور راون کی جنگوں کو دو متضاد سماجی اور معاشی طریقوں اور تمدنوں کا ٹکراؤ سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی ایک طرف ویدک آریوں کے زرعی سماج اور دوسری طرف غیر ویدک دراوڑی غیر زرعی سماج۔

رامائن اور ڈاکٹر بی آر امبیڈکر

1987 میں حکومتِ مہاراشٹرا کی طرف سے شائع کی گئی ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کی کتاب writings & speeches کے تیسرے حصے دسویں باب کا مطالعہ ہر اُس شخص کے لئے ضروری ہے جو ہمارے قدیم قصوں اور ان کے زمانے کا صحیح تجزیہ کرنا چاہتا ہو۔ یہاں ہم ڈاکٹر امبیڈکر کے تاریخ پر گہرے مطالعے اور معلومات سے دوچار ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس مفروضہ کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے کہ دونوں قصے رامائن اور مہابھارت بہت ہی قدیم زمانے میں ترتیب دیئے گئے تھے۔ وہ اس بات سے انکار تو نہیں کرتے کہ رام کا سلسلہ دار قصہ پانڈوؤں اور کوروؤں کی جنگ کے قصوں سے پُرانا ہے لیکن وہ اپنے فہم و ادراک سے اس تجزیے کو اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ "اس میں شک نہیں ہے کہ رامائن کا بہت بڑا حصہ مہابھارت کی کافی ترتیب کے بعد مرتب کیا گیا ہے۔

شنکرا (788 عیسوی تا 820 عیسوی) رامانُجا (1017 تا 1137) اور مادھوا (1197 تا 1276) کے ویدانتا سُترا (برہما سُترا) کی کئی تشریحوں کے گہرے تجزیے کے بعد شنکرا کے تعلق سے ڈاکٹر امبیڈکر سوال کرتے ہیں۔ "کیا یہ تشریح سُتروں کے تنقیدی مطالعہ کا نتیجہ ہے؟ یا پہلے ہی سے سوچے سمجھے منصوبہ کے حصول کے لئے زبردستی ہموار کیا گیا ہے؟" پھر وہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ سُتر خود 200 عیسوی میں لکھے گئے ہوں گے۔ اس کے لئے انہوں نے اس ضمن میں پروفیسر کیتھ اور پروفیسر جیکب کے نظریوں سے مدد لی ہے۔

پھر ڈاکٹر امبیڈکر کہتے ہیں ۔" مہابھارت تین بار لکھی گئی ہے اور ہر بار اُس کا عنوان اور مضمون بدلا ہُوا ہے ۔ پہلی بار جَیا (فتح) کے نام سے ویاس نے لکھا تھا، جس میں 8000 سے زیادہ اشلوک نہیں تھے ۔ ویشام پیانا کے ہاتھوں اس کی تعداد بڑھ گئی جس کو بھارت کہا گیا اور اس میں 24000 اشلوک ہوئے ۔ پھر سوتھی کے ہاتھوں اس میں 96836 اشلوک ہو گئے اور یہ مہابھارت بن گئی ۔

ہاپکنس کی گریٹ ایپکس آف انڈیا کے مطابق " پوری مہابھارت کا زمانہ عام خیال سے 200 عیسوی تا 400 عیسوی کا ہو سکتا ہے ۔"
(صفحہ 389)

ڈاکٹر امبیڈکر پھر کہتے ہیں :" لیکن اور بھی بہت سارے معاملات ہیں جو یقینی طور پر اس سے بھی بعد کے زمانے کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔ مہابھارت میں ہُنوں کا ذکر ہے ۔ سکند اگپتا نے ہنوں سے لڑائی کر کے ان کو 455 عیسوی میں شکست دی تھی ۔ اس کے علاوہ ہُنوں کے حملے 528 عیسوی تک ہوتے رہے ۔ اس سے اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یا اس کے بعد کے زمانے میں مہابھارت لکھی جا رہی تھی ۔"

مہابھارت میں مسلمانوں کا ذکر : اس کے بعد ڈاکٹر امبیڈکر نے ہمارا اشارہ ڈی ڈی کوسمبی کے بتائے ہُوئے چند نکتوں کی طرف کیا ہے :
" مہابھارت ملیچھوں یعنی مسلمانوں کا ذکر کرتی ہے ۔ مہابھارت کے وانا پُروا 190 باب کی 29 ویں شلوک پر کوسمبی کی تشریح ہے ۔" پوری دنیا مسلمان ہو جائے گی ۔ تمام آریائی منتر اور رسم و رواج اور دوسرے مذہبی تہوار ختم ہو جائیں گے ۔" یہ براہِ راست مسلمانوں کی طرف اشارہ ہے ۔ ڈاکٹر امبیڈکر متعجبانہ سوال کرتے ہیں کہ مہابھارت پُران ہوتے ہوئے آئندہ ہونے والے

واقعات کا ذکر کس طرح کر سکتی ہے۔ یہاں یہ ذکر صرف اس لئے ہُوا ہے کہ "مہابھارت مسلمانوں کے حملوں کے بعد بھی لکھی جا رہی تھی"۔

برہمنوں کا خوفزدہ ہونا

اسی باب کے 59 ویں شلوک میں کہا گیا ہے۔ " ورشالاؤں سے مغلوب ہو کر برہمن خوف سے ہراساں ہو جائیں گے اور تحفظ کا کوئی مقام نہ پاکر دنیا بھر میں درد سے کراہتے ہوئے اور روتے ہوئے گھومنے لگیں گے"۔ ڈاکٹر امبیڈکر یہ تجزیہ اس طرح کرتے ہیں۔ " ورشالوں کا مطلب "غیر مہذب" ہے۔ یہ اشارہ اسلامی حملہ آوروں کی طرف ہی ہو سکتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر مہابھارت کا ایک حصّہ یقیناً مسلمانوں کے حملوں کی ابتدا کے بعد ہی لکھا گیا ہے"۔

عیدگاہوں کا ذکر!

ڈاکٹر امبیڈکر لفظ "یدوکا" پر بحث کرتے ہیں جو مہابھارت کے ون پروا کے 190 ویں باب کے شلوک نمبر 65، 66 اور 67 میں موجود ہے۔ اور ڈی ڈی کوسمبی کے بیان کو تسلیم کرتے ہیں جنہوں نے مشہور بھٹ کی 'امرکوش' پر وضاحت کی بنیاد پر کہا ہے کہ 'یدوکا' کا مطلب مسلمانوں کے عیدگاہ سے ہی ہو سکتا ہے، جس کے آگے مسلمان عبادت کرتے ہیں۔ پھر ڈاکٹر امبیڈکر کہتے ہیں۔ اس سبب سے اور دوسرے اسباب سے بھی مہابھارت کے کئی حصّے محمد غوری کے حملوں کے بعد بھی لکھے جا رہے تھے۔ اور کہتے ہیں "یہ کہا جا سکتا ہے کہ مہابھارت 1200 عیسوی تک بھی لکھی ہی جا رہی تھی۔

پھر ڈاکٹر امبیڈکر ان مماثل محاوروں کا ذکر کرتے ہیں جو مہابھارت اور راماین دونوں میں موجود ہیں جن پر گریٹ ایپکس آف انڈیا میں پروفیسر ہاپکنس نے بحث کی ہے اور یہ کہتے ہوئے ختم کرتے ہیں کہ "راماین کے کچھ حصّے مہابھارت کے کچھ حصّوں سے قدیم ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ رامائن کا بہت بڑا حصہ مہابھارت کے بہت بڑے حصّے کے لکھے جانے کے بعد بھی لکھا گیا ہے"۔

مہابھارت میں رامائن کا ذکر ہے۔ کہیں کہیں رامائن کا ذکر اس کے مصنف کے نام کے بغیر ہے اور دوسرے مقامات میں والمیکی رامائن کا ذکر ہے۔ پروفیسر ہاپکنس کے مطابق موجودہ رامائن، والمیکی کی رامائن نہیں ہے۔ (گریٹ ایپکس آف انڈیا، صفحہ 62)

سی۔ وی۔ ویدیا کے مطابق "گاٹگا جیسے محقق اور معتبر و مستند مبصر کی سند کے باوجود جو رامائن ہمارے پاس موجود ہے وہ حقیقت میں والمیکی کی لکھی ہوئی رامائن نہیں ہے۔ ایک راسخ العقیدہ مفکر بھی ایسا سوچ نہیں سکتا۔ کوئی سطحی مطالعہ کرنے والا بھی اس میں موجود بدلتی ہوئی بے اصولی ٹوٹتے سلسلے، نئے اور پرانے خیالات کا پہلو بہ پہلو پایا جانا دیکھ کر ضرور حیرت زدہ ہوگا اور یہ کثرت سے آج کی رامائن میں موجود ہیں، چاہے ہم بنگالی حواشی کو لیں بمبئی کے حواشی کو۔ اور کوئی بھی یہ نتیجہ اخذ کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ والمیکی کی رامائن بنیادی طور پر کسی بعد کے زمانے میں دوبارہ لکھی گئی ہے"۔ (دوسرا باب صفحہ ۲ Riddles of Ramayana)

آخر میں ڈاکٹر امبیڈکر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "مہابھارت کی طرح رامائن بھی تین بار لکھی گئی ہے" اور پھر کہتے ہیں "جیسا کہ مہابھارت کے ساتھ ہوا ہے رامائن کے ساتھ بھی حجم بڑھانے کا کام

ہُوا ہے۔ ابتدا میں یہ صرف رام اور راون کے مابین جنگ کی کہانی تھی، جو رام کی بیوی سیتا کے راون کے ہاتھوں اٹھالے جانے کے باعث ہُوئی تھی۔ دوسری اشاعت میں اس کہانی کے ساتھ وعظ و نصیحت جوڑ دئے گئے اور ایک سادہ تاریخی کتاب ناصحانہ کتاب بن گئی اور اس کا مقصد سماجی، اخلاقی اور مذہبی فرائض کے اصولوں کی تعلیم بن گیا۔ جب یہ تیسری اشاعت کا روپ دھار گئی تو پھر سے مہابھارت کی طرح اس کو من گھڑت قصّوں، علمی بحثوں، فلسفوں اور دوسرے فنون اور سائنسوں کا مجموعہ بنا دیا گیا۔"

اس لئے یہ نتیجہ وثوق کے ساتھ نکالا جاسکتا ہے کہ جب مہابھارت خود ۱۲۰۰ عیسوی تک لکھے جانے کے منازل میں تھی تو مہابھارت کے لکھے جانے کے بعد رامائن کی تحریر کی تکمیل تیرھویں صدی کے بعد ہُوئی۔ یہی وہ دور ہے جبکہ بُدھ اور جین مت کے پیروؤں کو ایک غیر برہمن ہیرو فراہم کر کے ویدی مذہب اور پجاری طبقے کے زیرِ اثر لانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

ہمارے پاس تو اب صرف وہ قلمی اور چھپے ہُوئے نسخے موجود ہیں جن کو والمیکی کی رامائن کہا جاتا ہے۔ قدیم تحریروں کے ماہرین کے مطابق درختوں کے وہ پتے جن پر والمیکی نے اس قصّے کو لکھا تھا، کہیں بھی موجود نہیں ہیں۔

رامائن : ویدک مذہب کی نجات دہندہ

رام کی کہانی والمیکی کے زمانے سے بہت پہلے ہی ایک مثالی راجہ کی کہانی کے روپ میں عوام میں مشہور تھی ۔ الگ الگ مقامات اور وہاں کے رسم ورواج اور طریقۂ زندگی کی مناسبت سے اس کہانی کے کئی روپ تھے ۔ وید کے راویوں نے ان میں سے ایک روپ کو چُن لیا ۔ اور زیب داستان سے اس کو ایک شاہنامہ بنا دیا ۔ بدھ اور جین مت کے عروج سے پجاری طبقے پر سب سے زیادہ مار پڑی تھی ۔ یگنا ، یاگا ، ہوما اور برہمنی منتروں کا رامائن میں بہت اہم مقام ہے ۔ اس عقیدہ کو کہ رامائن کے سننے سے ثواب ملتا ہے ، گناہ دُھلتے ہیں ، بڑی کوششوں سے پھیلایا گیا ۔ جھوٹی کہانیاں گھڑنا ہندو نازیوں کا مخصوص فن ہے ۔

بقول سدھانتا چاریہ شری کے بھجا بالی شاستری جنھوں نے پدماپران نامی رامائن کا مختصر سا الگ ہی روپ version کنڑا زبان میں پیش کیا ہے اس نظریہ کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ ویدک مذہب اور جین مت دونوں نے رام کی کہانی کو چند اقدار کے اپنانے اور چند دوسرے اقدار کو ٹھکرانے کے لئے استعمال کیا ہے ۔" (پدما پران - 1971 - سماجا پستکالیہ دھارواڑ - کرناٹک)

وہ کہانی جو ایودھیا کنڈ سے شروع ہوتی ہے اور یدھا کنڈ تک پہنچ جاتی ہے پہلے ہی سے دوسری شکل میں " ابھی دھرما دِبھاشا " نامی ایک بدھ کتاب میں موجود تھی جس کے 12000 شلوک تھے ۔ والمیکی رامائن میں انتہائی قدیم زمانے کے خیالات و تفصیلات بتلائے گئے ہیں ۔ علماء کا خیال ہے کہ ان میں سے بہت ساری تفصیلات کہانیوں کی شکل میں بدھ

(چھٹویں صدی ق۔م) کے زمانے میں ہی موجود تھے۔ علماء کی رائے ہے کہ رام کی کہانیاں کچھ اس طرح لکھی گئی ہیں کہ گویا یہ دسویں صدی ق۔م میں واقع ہوئی ہیں۔

جین روایات میں رام کی بہت ساری کہانیاں وِملاسُوری، سوایمبھو، ہیمچندر، گُن بھدرا اور پشپادنتا جیسے بہت سے شاعروں کی نظم کی ہوئی ہیں۔ جن میں آچاریہ روی شینا کی پدم پران سب سے مشہور کہی جاتی ہے۔ یہاں پدم رام کا ایک اور نام ہے۔ ایک اور جین راماین راگوچریتا والمیکی رامائن کے بعد لکھی گئی ہے۔ ڈاکٹر جیوتی پرشاد جین کہتے ہیں کہ رام کے نام کا ماخذ ہی جینی ہے۔

(ادھیہ تیرتھا ایودھیا)

یہ سب تفصیلات اس بات کی وضاحت کے لئے بتائی گئی ہیں کہ ایودھیا کو ویدک روایات کے تحت زیارت گاہ بنانے میں بھی جین مت کے اثرات ہیں۔ ویدک روایات نے ایودھیا کو ایک مقدس مقام گیارھویں صدی عیسوی میں بنایا ہے۔

البتہ ڈاکٹر جیوتی پرساد جین کا یہ شک کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جین آچاریہ پربھوسوری کے بتائے ہوئے بہت سارے مندروں کو بابر نے توڑ ڈالا ہے" (ادھتیہ ایودھیا۔ ڈاکٹر جیوتی پرساد جین صفحہ 45) بے بنیاد ہے۔ ان کے اسباب پر ذیل کے صفحات میں بحث کی گئی ہے۔

بابر کو نہ کسی کا خوف تھا اور نہ کوئی وجہ تھی کہ وہ اپنی سوانح حیات "بابرنامہ" میں ان تفصیلات کو ڈھانپتا، اس لئے کہ بابرنامہ اس وقت لکھا گیا جب وہ اپنے اقتدار کے منتہا پر تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ اس نے گوالیار کے قریب وادیٔ ادواہ میں ننگے جین بُتوں کو یقیناً

توڑ دینے کا حکم دیا، اس لئے کہ یہ اس کی نظر میں فحش تھے۔ اس کا یہ حکم ان بتوں پر نہ تھا جو ننگے نہیں تھے۔ اس کا حکم حیا کے احساس کے باعث تھا نہ کہ مذہبی جذبات کے باعث۔

بابر کے ایودھیا میں اسی طرح جین بتوں کے توڑنے پھوڑنے کے امکانات پر ڈاکٹر جین کا بیان اوزان کا خیال کہ اس نے جین مندروں کے ستونوں کو بابری مسجد کی تعمیر کے لئے استعمال کیا ہوگا، شک و شبہ کے انداز میں ہے اور یقینی نتیجوں پر مبنی نہیں ہے۔ ان کے ماخذ کو دیکھیے:

"ایودھیا میں جین بتوں کی عریانیت اور فحاشی نے اس کو ان کے بھی توڑنے پھوڑنے پر اکسایا ہوگا اور بابری مسجد میں استعمال کئے گئے سیاہ ستون جین مندروں کے کھنڈرات سے لئے گئے ہوں گے۔

(Adhithirth Ayodhya - صفحہ ۱۵)

یہ شک بھی آگے آنے والے صفحات میں دیئے گئے اسباب کی بنا پر بے بنیاد ہے۔

اکبر کے دورِ حکومت میں جین مت والوں کی با اثر حیثیت اس بات سے ثابت ہوتی ہے کہ راجہ ٹوڈرمل جین اکبر کے وزیرِ محصولات تھے۔ جن کے محصولات کے قانون آج بھی کم و بیش اسی طرح رائج ہیں۔ عبادت خانہ میں جو اکبر نے تمام مذاہب کے اصولوں پر بحث کے لئے فتحپور سیکری میں بنایا تھا، اس کے مقبرے میں اور دوسرے مقامات میں جین مذہب کے مذہبی نشانات خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جین مذہب کے اثرات لوگوں پر موجود تھے۔

لیکن "رام کی پوجا" کے جاری ہونے کے سبب جین اثرات مٹ گئے، جس کے نتیجے میں بہت سارے مقامات پر مندر اور مٹھ تعمیر ہونے لگے،

جن میں ایودھیا بھی شامل ہے۔

کرشن کی حکایت بھی علاحدہ نہیں ہے۔ کرشن کے معنی کالے کے ہیں۔ ڈی ڈی کوسمبی کے مطابق

(The culture and civilization of Ancient India 1964)

"کرشن رگ وید میں اندرا کا دشمن بھوت ہے۔ یہ آریہ سے پہلے کی سیاہ فام لڑاکا قوم کا عام نام ہے"

بھاگوتم نے کرشن کو ایک چرواہا لڑکا بتایا ہے۔ اس کو گوپال، گوکل واسی، نوانت چورا وغیرہ کہا گیا ہے۔ ہم جس کرشن سے واقف ہیں وہ غیر آریہ اور آریہ سے پہلے کے قبیلے کا ایک جری سردار ہے جن کو مویشی بہت عزیز تھے۔ اس نے گائے اور بیل کی قربانی دینے والے یگنوں اور گائے کا گوشت کھانے والے ویدک برہمنوں سے لڑائیاں کی ہوں گی۔ کوسمبی لکھتے ہیں۔" ویدک برہمنوں نے قربانی کی گائیوں کا گوشت کھا کھا کر اپنے آپ کو موٹا کر لیا تھا"۔ ویدک روایت نے یہ سمجھوتہ کر لیا ہوگا اور کرشن کو خدا بنا دیا ہوگا بالکل اسی طرح جس طرح ویدوں کے دشمن بدھ کو وشنو کا اوتار بنا دیا گیا۔ کرشن کو مہابھارت کے درمیان لا ڈالنا اور بھگوت گیتا کو ان کے منہ سے کہلوانا وغیرہ ایک علیحدہ قصہ ہے جو اس کتاب کے احاطہ سے باہر ہے۔

(۷)

ہندومت میں تشدد

ویدک مذہب کی بالادستی کو اور اس کے ذریعے برہمنی اقتدار کو پھر سے جاری کرنے کے لئے رامائن کو یکجا کرنا ہی کافی نہیں تھا۔ یہ تو پروپگنڈے کے ذریعے کیا گیا۔ اس کے علاوہ بدھ مت اور جین مت کو طبعی طور پر مٹانے کی ضرورت تھی جو جین مندروں کو برباد کرنے یا ان کو رام یا وشنو مندروں میں تبدیل کرنے کے ذریعے ہو سکتی تھی۔ یہ دعویٰ کہ ہندومت تمام مذہبوں میں سب سے زیادہ روادار اور تحمل گذار مذہب ہے اور یہ کہ مندروں کو مسمار کرنے والے ہمیشہ مسلمان رہے ہیں۔ اور یہ کہ صرف ہندو اور ہندوؤں کے مندر ہی مسلمان حملہ آوروں کے شکار رہے ہیں۔ یہ سب ہماری جھوٹی تاریخ کے نصاب میں پڑھائی جانے والی کتابوں کے عظیم ترین جھوٹ ہیں۔ ہندو بنیاد پرستوں کا آج مسلمانوں پر جو غضب ہے وہ اس لگاتار رٹائے جانے والے جھوٹ کا براہِ راست نتیجہ ہے جس کے ذریعے ہمارے غلط تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دماغوں کی دباغت کلاس رُوموں میں ہوتی رہتی ہے۔

ایک عام "تعلیم یافتہ" ہندوستانی کے لئے اس ٹھوس حقیقت کے ماننے میں بہت مشکل ہوتی ہے کہ ویدک مذہب دُنیا کا سب سے زیادہ تشدد پسند بلکہ خونخوار مذہب ہے۔

(Deceptive Hindu Tolerance – V.T. Raja Shekar – Statesman – Dec. 1. 1987)

اگر دُنیا میں کوئی مذہب ہے جس نے اپنے مذہبی احکام کے ذریعہ

یہ قانون بنایا ہے کہ اگر چند مخصوص طبقے والے بغیر ارادے کے بھی ویدوں کے جپنے کی آواز سن لیں تو پگھلا ہوا سیسہ اُن کے کانوں میں اُنڈھیلا جائے تو وہ ویدک مذہب ہے جس کا نیا نام ہندوازم ہے۔ کسی کی زندگی لینے کے لئے اس سے زیادہ بے سروپا و لغو شیطانی تشدد کا طریقہ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ اور بھی بہت سارے دماغی، نفسیاتی اور سماجی تشدد کے طریقے جو ویدک روایات کے تحت مذہبی طور پر جائز اور عملاً رائج ہیں ان کا ذکر موجودہ بحث کے لئے ضروری نہیں۔

ویدک مذہب کی اسی تشدد دوستی کے باعث بدھ مت، جین مت، سکھ مت اور ویرشیوا مت جیسے باغی مذہبوں نے جنم لیا اور اتنے سارے لوگ اسلام اور عیسائیت قبول کرنے پر راغب ہوئے۔ یہ ایک بہت بڑا اتہام ہے کہ عوام کو "مجبوراً" مسلمان کیا گیا۔ سوامی وویکنندا کے مطابق اسلام نے ان سب کو پناہ دی جو پجاریوں کے ظلم وستم کے شکار تھے۔
(complete works of swamy vivekananda vol: 5 and 6)

ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کے خیالات میں جو درد آشکارا ہے اس سے ویدک مذہب میں موجود تشدد کے مختلف طریقوں کا ثبوت ملتا ہے۔

وہ لوگ جو مسلمانوں پر بُت شکنی کے لگاتار الزامات لگاتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے اُن کو سانپ سونگھ جاتا ہے جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ ان سیکڑوں بدھ وہاروں کا کیا ہوا جو چینی سیاح ہوینت سانگ نے 629 عیسوی سے 642 عیسوی تک ہندوستان کے سفر میں دیکھے تھے اور قلمبند کیئے تھے۔ ویدک مذہب اختیار کرنے والے راجاؤں اور پجاریوں نے ان بدھ وہاروں کو برباد کیا ہوگا۔ یہ بہت ممکن ہے کہ بت تراشی

اور بت پرستی اور مندروں کی تعمیرات کے کا کام بدھ کی تصویروں اور جینی بتوں کے دیکھنے کے بعد ویدک مذہب کے جز بن گئے ہوں جو ان دونوں غیر ویدک مذہبوں کے بہترین دور میں ملک بھر میں لگائے گئے تھے۔
آدی شنکرا کی کہانی ایک کامیابی کی داستان ہے۔ اس نے بدھ مت کو تباہ کیا اور ویدک مذہب کو پھر سے زندہ کیا۔ اس نے یہ کس طرح کیا یہ ایک بڑی غمگین داستان ہے جو صرف خون کے الفاظ میں لکھی جاسکتی ہے۔

اے۔ ایچ۔ لانگھرسٹ کہتے ہیں "جس بے رحمی سے ناگ ارجن کونڈا کی عمارتوں کو ڈھا دیا گیا ہے وہ لرزاں کر دیتا ہے۔ یہ کام صرف دولت سمیٹنے والوں کا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ بہت سارے ستون، مجسمے اور نقوش جان بوجھ کر ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے ہیں۔ مقامی روایت بتاتی ہے کہ وسطی دور کے عظیم ہندو فلسفی اور مبلغ شنکرا چاریہ اپنے بہت سارے چیلوں کے ساتھ ناگ ارجن کونڈا آئے تھے اور بدھ تعمیرات کو تباہ کیا۔ جو کچھ بھی ہو، یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وادی کی وہ مزروعہ زمینات جن پر یہ کھنڈرات ہیں شنکرا چاریہ کو دئے گئے مذہبی عطیہ جات میں شامل ہیں اور اس عظیم استاد کے پیروؤں کے موجودہ مذہبی سردار سے اجازت نامہ حاصل کرنے کے بعد ہی میں اپنی کھدائی کا کام کر سکا۔"

(Memoirs of Archaeological survey of India No.54 The Budhist Antiquities of Nagrajan Konda – A.H. Longhurst Delhi 1938, P.6)

مونیر ولیمس کہتے ہیں۔ "بے شک وقتاً فوقتاً مخصوص مقامات میں

مختلف اوقات میں ظلم وستم ہوا۔ اور اس بات کی تحقیق ہو چکی ہے کہ کماریلا اور شنکرا جیسے متعصب وجوشیلے برہمنوں نے کبھی کبھی خونریزی اور تشدد پر بھی لوگوں کو اُکسایا؟"

(Studies in Budhism — Monier williams P. 88 (1953) ed., F. Max Muller)

سچ کو غلط بیانی کے روپ میں جھوٹا کرنا یا حقیقت پر پردہ پوشی کرنے کے ساتھ ساتھ تشدد کا استعمال کرنا ویدک دماغ کو فخر کا مقام دیتا ہے۔ ایک ہزار سال تک بدھ کو اور خود سنسکرت میں موجود بدھی تحریروں کو چھوڑ دیا گیا بلکہ بُھلا دیا گیا۔ سردار کے۔ یم۔ پیانیکر A Survey of Indian History 1971 میں کہتے ہیں۔" یہ یوروپین علماء کا کام تھا کہ اُنہوں نے سکیامُنی (بدھ) کو پھر سے مقام دیا۔ اشوک کو جس کا نام ہندوستان کی تاریخ سے نکال دیا گیا تھا۔ پھر سے اپنے معزز مقام پر پہنچایا گیا۔ آج اس کا نام ہندوستانیوں کے ذہن میں دوسرے حکمرانوں سے زیادہ بلند ہے۔ یہ کسی ہندوستانی محقق کے سبب نہیں بلکہ یوروپین علماء کا کام ہے"۔ اس مضمون پر گہری تفصیلات کے لئے دیکھئے پروفیسر یس۔ کے بھگوان کی violence in Hinduism - Dalit Sahitya Academy پروفیسر بھگوان میسور یونیورسٹی میں انگلش کے ریڈر ہیں اور سنسکرت کے عالم بھی۔

اس پورے تشدد اور جھوٹ کے باوجود جس کے ذریعے ویدک مذہب نے سچ اور اہمسا کے پیغامبر بدھ سے لڑائی کی، بدھ کی شاندار شخصیت نے عوام کے ذہنوں پر نہ مٹنے والا اثر قائم رکھا تھا۔ پھر کیا کرتے؟ تو وہ جھک گئے اور بادلِ ناخواستہ بدھ کو وشنو کا اوتار بنا ڈالا۔

یہ ویدک دماغ کی دانشمندانہ بے ایمانی اور عالمانہ کمینے پن کی شاندار مثال ہے۔

"ہندوستان سے بدھ مت کے کُلّی اخراج کے اسباب کی وضاحت ان برہمنوں نے بہت ساری خلافِ عقل کہانیاں گھڑ کر کردی ہے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ بدھ مت بھی ہندومت کی طرح مذہب سے زیادہ ایک سماجی نظام ہے۔ یہ سب کہانیاں جھوٹی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بدھ مت کا اخراج قتلِ عام، لوٹ مار اور غارت گری کے نتیجے میں ہوا۔ شمال و جنوب، مشرق و مغرب، تمام اطراف میں عوامی بول چال کی زبانوں کی مسخ شدہ شکلوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہر طرف عوام کے جتھے کے جتھے خلط ملط ہو رہے تھے۔ ایسا عام قتل و خون کے نتیجے میں ہی ہوسکتا ہے، جیسا کہ پنجاب میں تقسیم ہند (1947) کے دوران دیکھا گیا۔ مسلمانوں کے سندھ کی فتح پر ابوالقاسم کی لکھی ہوئی عربی تاریخ "کاکنامہ" اس دور میں برہمنوں کی بدھ مت کے ماننے والوں کے خلاف کی گئی خونریز جنگ کی اچھی تصویر پیش کرتی ہے۔"

[This Hindi And Devnagri : Madan Gopal 73 صفحہ Metropolitan Book Co. Ltd. 1953]

اور ڈاکٹر جیوتی پرساد جین اپنی ادھیتیرتھ ایودھیا میں لکھتے ہیں کہ "معلوم ہوتا ہے کہ بابری مسجد میں استعمال کئے گئے سیاہ ستون جین مندروں کے کھنڈرات سے لئے گئے ہوں گے؟ (صفحہ ۱۸)۔

اس لئے بحث کے لئے اگر ہم اس بات کو تسلیم کرلیں کہ بابری مسجد مسلمانوں کو نہیں دی جاسکتی، تو پھر اس کو جین مت والوں کے

حوالے کرنا ہوگا، ہندؤں کے حوالے نہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر جین صرف اندازہ لگاتے ہیں اور شک کرتے ہیں کہ بابر نے جین مندروں کو ڈھا دیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔

ویدک مذہب اور جین مت کے درمیان ہونے والی ان لڑائیوں کی روشنی میں، ویدک مذہب کے پیرؤں نے ایودھیا کے جین مندروں کو ڈھا دیا ہوگا۔ ان کھنڈرات سے سیاہ ستون بابری مسجد کی تعمیر کے لئے اٹھا لئے گئے ہوں گے۔ حقیقت میں یہی وہ قریب ترین درست نکتہ ہوسکتا ہے جس پر ہم اس سوال سے موصول مواد کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔

یہ پروپگنڈا کہ یہ مسلمان ہی ہیں جنہوں نے ہر وقت تعمیرات کو ڈھا دیا ہے اور یہ ہندو (ویدک روایت) ہی ہیں جو ہمیشہ معصوم رہے ہیں، اتنی شدت سے کیا گیا ہے کہ ڈاکٹر جین کے جیسے شخص بھی اس خیال سے بیگانہ رہ گئے ہیں کہ ویدک ہندؤں نے ایودھیا میں جین مندروں کو توڑ ڈالا ہوگا۔ ان کی پروازِ خیال نے بابر کو خواہ مخواہ کا شکار بنا دیا ہے۔

ہمارے غلط تعلیم یافتہ ذہن یہ سوچنے پر تیار نہیں ہیں کہ ویدک مذہب کے پیرؤں نے ایودھیا میں جین مندروں کو ڈھا دیا ہے۔ حالانکہ حالات اس نتیجے پر پہنچنے کے لئے کافی باوثوق ہیں۔ پر وہ اس نتیجے کو یک لخت باور کرتے ہیں کہ یہ بابر ہی تھا جس نے ایک ہندو مندر کو مسمار کیا اور اسی مقام پر ایک مسجد تعمیر کی۔ حالانکہ اس کے لئے کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

(۸)

دروغ بیانی کی یک رُخی تصویریں

یہ مطالبہ کہ بابری مسجد جو پچھلے ساڑھے چار سو سال سے مسلمانوں کی عبادت گاہ رہی ہے مسلمانوں سے چھین لی جائے اور یہ کہ یہ ہندوؤں کے قبضے ہی میں رہے کسی نئی تاریخی دریافت کی بنا پر نہیں ہے۔ مُسلمانوں اور اسلام کو بدنام کر کے لُطف اندوز ہونے والے ایک اعلیٰ ذاتی طبقے نے فیصلہ کیا کہ پہلے بابری مسجد پر قبضہ کر لیا جائے اور پھر اس قبضے پر حق ثابت کرنے کے لئے ایک مفروضہ تیار کر لیا گیا۔ پھر اپنے مقاصد کا جواز ثابت کرنے کے لئے تاریخ کو ایک نیا موڑ دینا شروع کر دیا۔ جنہوں نے یہ ثابت کرنے کی قسم کھائی تھی کہ واقعی بابر نے رام مندر کو ڈھا دیا اور اس کی جگہ مسجد تعمیر کی۔ ان کو پہلے یہ ثابت کرنا ضروری تھا کہ اس مقام پر واقعی ایک رام مندر بھی تھا۔ اس جھوٹ کے سب سے بڑے معمار ڈاکٹر رادھے شیام گُنسکل ہیں، جنہوں نے چند کتابیں لکھی ہیں، جیسے رام جنم بھومی، سچتر ابرامانک اتہاس (مصور مستند تاریخ) وغیرہ۔ یہ کہتے ہیں کہ سِکندا گپتا نے جو چندر گپتا دُوم اور وکرما دتیہ کے نام سے بھی مشہور ہے ایودھیا کا پتہ لگایا اور جنمستھان مندر تعمیر کیا۔ یہ ثابت کرنے کے لئے وہ 'بھیتری کتبہ' نامی ایک تحریر پر بھروسہ کرتے ہیں، جو غازی پور کے قریب بِھتری نامی ایک گاؤں میں پایا گیا ہے جو ایودھیا سے 250 کلومیٹر راست فاصلے پر واقع ہے۔ اس کتبے کے سلسلے میں تین نکتے حل طلب ہیں۔

پہلا یہ کہ ہم نہیں مان سکتے کہ جس راجہ نے ایودھیا میں مندر تعمیر کیا اس نے اس کا کتبہ جائے وقوع سے 250 کلومیٹر دُور رکھوایا۔

دوسرا یہ کہ اس کتبے میں رام کا نام تک نہیں ہے۔ اس میں بس اتنا بتایا گیا ہے کہ سکند اگپتا نے شرنجن کے نام پر ایک مندر بنوایا۔ شرنجن تیر اور کمان لئے ہوئے وشنو کو کہتے ہیں۔

تیسرا یہ کہ یہ کتبہ سکند اگپتا کو ایک شہنشاہ نہیں بتاتا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ شہنشاہ ہونے سے پہلے سکند اگپتا غازی پور کا گورنر تھا۔

اپنی منطق کے غلط سلط گورکھ دھندہ سے بچنے کے لئے ڈاکٹر شُکل کہتے ہیں: "یہ میرا ایمان ہے کہ یہی وہ مندر ہے جو جنم ستھان پر بنایا گیا تھا۔" اور پھر کہتے ہیں کہ "شرنجن وشنو، رام کا مماثل بھی ہو سکتا ہے۔"

لیکن ڈاکٹر شکل یہ بھول جاتے ہیں کہ تاریخ اور ایمان دو علاحدہ چیزیں ہیں۔ حقیقتیں تاریخ بناتی ہیں، ایمان نہیں بناتے۔ پھر ان الفاظ پر غور کیجئے: "کے مماثل ہو سکتا ہے۔" اس لحاظ سے رام بدھ کے برابر بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ بُدھ کو بھی وشنو کا اوتار کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر شکل ہمیں اس بات کا یقین دلانا چاہتے ہیں کہ مسجد کی تعمیر کے لئے بابر کے ڈھائے ہوئے مندر کے سیاہ کسوٹی کے 84 ستون تھے اور اس کی پانچ تا سات منزلیں تھیں۔ لیکن ایودھیا کی کھدائی کے بعد آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کچھ اور ہی کہتی ہیں:

"یہ قابلِ ذکر بات ہے کہ اس مقام پر گپتا دور کی ہلکی سی جھلک بھی ظاہر نہیں ہوتی اور یہ بات 1975 کی پہلی کھدائی میں بھی ظاہر ہو چکی ہے۔"

حقیقت تو یہ ہے کہ رام جنمستھان مندر اب بھی ایودھیا
میں موجود ہے اور عالمی شہرت والے آثارِ قدیمہ کے ماہر الکسنڈر کنگھم
نے 65 - 1862 میں دیکھا ہے۔

(Archaeological Survey of India Report
1862 - 65)

رام جنمستھان کے نام والے مندر کو سولہویں صدی میں بابر
نے ڈھا دیا ہوتا تو یہ کیسے ممکن ہُوا کہ انیسویں صدی میں الکسنڈر کنگھم
نے اس کو دیکھا ؟

ہم یہاں ہندو نازیوں سے یہ کہنے پر مجبور ہیں۔ "یہ ثابت
کرنے کے لئے کہ ایک مندر کو ڈھا دیا گیا، پہلے تمہیں یہ ثابت کرنا ہوگا
کہ ایک مندر پہلے موجود تھا۔ اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ مندر موجود
تھا، تمہیں یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ اس کو تعمیر کیا گیا تھا"۔

ڈاکٹر شُکل کا مفروضہ مُنہ کے بَل گر پڑتا ہے، اس لئے کہ
ان کے مطابق جس مندر کو بابر نے ڈھا دیا تھا اس کے 84 کسوٹی کے
سیاہ ستون تھے۔ جن کو استعمال کرکے بابری مسجد بنائی گئی۔ کسوٹی
ایک سیاہ پتھر ہے جو سونے اور سونے کے زیورات کی اصلیت کی پرکھ
کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن بابری مسجد کے ان سیاہ ستونوں کو
سونے کی مدد سے جب پرکھا گیا تو معلوم ہُوا کہ یہ کسوٹی کے پتھر
نہیں ہیں۔

(آگے بارھواں باب "تاریخ کے محقق" صفحہ 50 پر دیکھئے)

(۹)

ایودھیا کہاں ہے؟

تاریخ کو چھوڑیئے۔ خود والمیکی کی داستان بھی ہندو نازیوں کی تائید نہیں کرتی۔ اُترکھنڈ کے پہلے سارگ کی 115 ویں بیت کہتی ہے:

ادھیار دھایو جنم گنگوا ندی پاس چین مُکھاس رہیتم

اور بالکنڈ کے دوسرے سارگ کی ۲۲ ویں بیت کہتی ہے:

ادھیار دھایو جنم گنگوا سرائے وا دکشنے ــــــ تتے

اس طرح والمیکی راماین کے مطابق سریو ندی مغرب کی طرف بہتی ہے اور ایودھیا کا شہر اس کے جنوبی کنارے پر واقع ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُتر پردیش کے فیض آباد ضلع میں آج کا ایودھیا بے شک سریو ندی کے جنوبی کنارے پر واقع ہے، لیکن ندی مشرق کی طرف بہہ رہی ہے۔

نبن چندر گھوش کی A Note on Ancient Geography of Asia کے ایک نوٹ کے مطابق اپنے باپ راجہ دسرتھ کی موت کی خبر سُن کر بھرت ورجاگیری سے جو آج کے پنجاب میں ہے ایودھیا واپس ہوتا ہے تو ایک جنگل سے گذرتا ہے اور ترپاٹھی رام شنکر کی History of Kanuj upto the Moslem conquest کے مطابق جب یشو ورمن ایودھیا آتا ہے تو مندارا کی پہاڑیوں کے باسی اس کی اطاعت قبول کرتے ہیں اور یہ مقام خاص خوشبو سے بھرا ہُوا ہوتا ہے جو دیودار کے پیڑوں کے سوراخوں سے

نکلتی رہتی ہے''

یہ تفصیلیں نیپال میں رُکم کوٹ اور دھولگیری کی برفیلی چوٹیوں سے مطابقت رکھتی ہیں۔ سرجو ندی یہاں سے نکل کر 150 میل کے فاصلے تک مغرب کی طرف بہتی ہے اور ہندوستان میں داخل ہونے سے پہلے اچانک اُلٹا راستہ (U. Turn) اختیار کر کے مشرق کی طرف بہنے لگتی ہے۔ اگر والمیکی کا بتایا ہوا ایودھیا کا نقشہ صحیح ہے تو یہ مقام نیپال میں سریو ندی کے جنوبی کنارے پر اس مقام سے 13 یا 14 میل کے فاصلے پر ہونا چاہیے۔

شیر سنگھ کے ساتھیوں کی کتاب سیکولر شہنشاہ بابر Secular Emperor Babar میں یہ عظیم تحقیق نازیوں کی جدوجہد کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے۔

(۱۰)

گمراہ کن اور بے بنیاد گزیٹر

1905 کا فیض آباد ڈسٹرکٹ گزیٹر کہتا ہے: "جنم ستھان رن کوٹ میں تھا اور رام کی پیدائش کا مقام سمجھا جاتا تھا۔ 1528 میں بابر ایودھیا آیا اور ایک ہفتہ مقیم رہا۔ اس نے قدیم مندر کو ڈھاکر اس کے مقام پر ایک مسجد تعمیر کی جو آج بھی (1905 میں) بابری مسجد کہلاتی ہے۔ پرانی عمارت کا بہت سارا سامان استعمال کیا گیا اور بہت سارے ستون اچھی طرح محفوظ ہیں جو سیاہ دانے دار پتھر "کسوٹی" کے ہیں، جس کی تراش مقامی باشندوں نے کئی طریقوں سے کی ہے"۔

1905 کے اس گزیٹر میں جس نے بھی یہ بیان شامل کیا ہے وہ نہ تاریخ سے واقف تھا اور نہ آثار قدیمہ کے رپورٹوں سے۔ 1960 کے فیض آباد گزیٹر میں 'ایودھیا کی تاریخ' دوسرے باب میں دی گئی ہے اور انیسواں باب "دلچسپ مقامات" کے لئے وقف ہے۔

مسز ای بی جوشی تاریخ پر لکھتی ہوئی کہتی ہیں کہ بابر ایودھیا میں "چند دنوں کے لئے" قیام پذیر ہوا۔ اور یہ کہ باقی تاشقندی نے "اس کے دورِ حکومت میں" اور اپنی گورنری کے زمانے میں 1528 میں ایک مسجد بنائی۔

"دلچسپ مقامات" کے باب میں لکھا ہوا ہے: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 1528 میں بابر ایودھیا آیا اور اس کے حکم پر اس قدیم مندر کو

ڈھا دیا گیا اور اس کی جگہ پر وہ (عمارت) بنائی گئی جو بابری مسجد کہلاتی ہے۔"

آیئے ہم ان بیانات کا تجزیہ کریں۔

اول یہ کہ دونوں بابوں میں دیئے گئے واقعات ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے۔ دوم 1905 کے گزیٹر میں جس یقین سے کہا گیا ہے کہ (بابر وہاں ایک ہفتے کے لئے قیام پذیر تھا) 1960 کے ایڈیشن میں نہیں پایا جاتا جو "چند دنوں کے لئے" بتاتا ہے۔

سوم: 1905 کے گزیٹر کو پورا یقین اور اعتماد ہے کہ بابر نے مندر ڈھا دیا اور اس کے مقام پر مسجد تعمیر کی۔ لیکن 1960 کا گزیٹر ایسا یقین ظاہر نہیں کرتا۔ یہاں ایسا تاثر دیا جاتا ہے کہ کسی نے اس کے حکم پر مندر ڈھا دیا تھا۔ پھر یہ کہتا ہے۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے" کہ بابر 1528 میں ایودھیا آیا۔ ان فیصلہ کن الفاظ "ایسا معلوم ہوتا" کے استعمال کا کوئی سبب نہیں بتایا جاتا۔ جو دراصل 1905 کے ایڈیشن کے تیقّن کو کمزور کرتا ہے۔

1877 کے اودھ گزیٹر میں بابری مسجد کے ستونوں کو "بدھی" بتایا گیا ہے۔ 1905 کا گزیٹر اس بات کو مطلق چھوڑ دیتا ہے اور اس کے لئے کوئی سبب نہیں پیش کرتا۔ 1960 کا گزیٹر بالکل ہی نئی بات لے کر آتا ہے کہ "اس کے بہت سارے ہلکے سے تراشے ہوئے ہندو خاکے ہیں۔" 1877 کا گزیٹر ایک انگریز افسر پی کارنیگی نے لکھا تھا اور 1960 کا ہندو افسروں نے۔ قدیم دستاویز میں رد و بدل کا شاید یہی سبب ہے۔ گزیٹر کہتے ہیں کہ بابری مسجد کے ستون کالے پتھر کسوٹی کے ہیں۔ یہ پتھر سونے کے زیورات کی

اصلیت جانچنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

شیر سنگھ کے ساتھیوں نے سونے (اصلی اور نقلی) کے ذریعے ان ستونوں کو پرکھا اور پتہ لگا لیا کہ یہ کسوٹی کے نہیں ہیں۔

شیر سنگھ کی ٹیم نے اور بھی متضاد باتیں ڈھونڈھ نکالی ہیں۔ اس لئے گزیٹیر تاریخ کے لئے بہت کم قابلِ قدر ذریعے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے لکھنے والے مورخ نہیں بلکہ سرکاری افسر ہوتے ہیں۔

(۱۱)

ایک ماہر کا فیصلہ

انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ کے فیلو ڈاکٹر آر، ناتھ سے بہتر ماہر ہمیں یہ بتانے کے لئے نہیں مل سکتا کہ بابری مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں بابر کا کیا مقام تھا اور آیا کوئی مندر اس کے ہاتھوں یا اس کے احکامات پر ڈھایا گیا تھا۔ ڈاکٹر ناتھ کے پاس دو ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں ہیں اور وہ تاریخ ہندوستان کے مغل دور اور مغل فنِ تعمیر پر مہارت رکھتے ہیں۔

ان کے مطابق بابر کی بنائی ہوئی ایک ہی مسجد ہے جس میں ہندو مندر کے ستون استعمال کئے گئے ہیں اور وہ سمبھل کی مسجد ہے۔ اس نے کوئی مندر نہیں ڈھایا بلکہ صرف ان ستونوں کو استعمال کیا، جو مندر کے کھنڈروں میں پڑے ہوئے تھے۔ " ہندو مندر کے ستون جو اس کے ہی مقام پر کھڑے ہوئے تھے اور جو غلام گردشوں میں باقی تھے!! زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ سمبھل میں بابر نے ہندو مندر کے ان ستونوں کو استعمال کرنے سے پس و پیش نہ کیا جو اس کی آمد سے پہلے ہی اُکھڑے ہوئے تھے۔

سمبھل، پانی پت، روہتاک، ماہم، سونی پت، پالم (دہلی)، پیلکھانہ، آگرہ اور ایودھیا کی مسجدوں کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے وہ بس اتنا ہی کہتے ہیں کہ " ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تمام مسجدیں دراصل بابر کی بنائی ہوئی ہیں۔ ان سے اس کا نام اس لئے جوڑ دیا گیا ہے کہ وہ شہنشاہِ وقت تھا۔

فیض آباد کے قریب ایودھیا میں بابری مسجد کے بنیادی طور پر تین کتبے تھے جن میں 935 ہجری یعنی 1528 عیسوی، میر باقی کے ہاتھوں بابر کے حکم سے اس کی تعمیر کا ذکر تھا۔ وہ پھر کہتے ہیں: "یہ قرینِ قیاس نہیں ہے کہ بابر کا نام رکھنے والی ان مسجدوں کی تعمیر میں بابر کا کوئی حصہ تھا۔ ان کی تعمیر رائج الوقت دہلی سلطنت کے طرز پر ہوئی تھی اور بابر کا نام رواجی طور پر حاکمِ وقت کی حیثیت سے لیا گیا تھا۔"

ڈاکٹر آر ناتھ کے نظریے سولہویں باب کے ساتھ ملا کر پڑھے جائیں تو ثابت ہو جاتا ہے کہ بابر کبھی بھی ایودھیا نہیں آیا تھا اور وہ بابری مسجد کی تعمیر کے لئے ذمہ دار بھی نہیں ہو سکتا۔ کسی مندر کے ڈھائے جانے کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔

نیپال اور ایودھیا کی سرحدی لکیر بھی ہمارے لئے ایک اور قابلِ غور بات ہے۔ اگر ایودھیا میں ایک مندر ڈھایا جاتا تو نیپال کی ہندو حکومت کی راجدھانی میں اس کا ردِّ عمل ہوا ہوتا اور اس تخریبی کام کا ذکر یہاں کے اس دور کی تحریروں یا بعد کے دور کی تحریروں میں کسی نہ کسی ہندو پنڈت کے ہاتھوں ہوا ہوتا۔

(۱۲)

ہمارے محقق اور تاریخ

بابر کی حق پرستی تسلیم کرتے ہوئے ڈاکٹر شُکل نے یہ سند دی کہ اگر بابر نے مندر کے ڈھائے جانے کا حکم دیا ہی ہوتا تو اس نے یقیناً اس کے بارے میں لکھا ہوتا۔ اس جملۂ معترضہ پر ہمیں ڈاکٹر شُکل کا مشکور ہونا چاہیئے۔

لیکن چونکہ اس کی ڈائری کے صفحات ۲/ اپریل 1527 سے ۱۸/ ستمبر 1528 (ساڑھے سترہ مہینے) تک کے نایاب ہیں، اس لئے خود بابر کے مندر کے ڈھائے جانے والے بیانات ہم پڑھ نہیں سکتے۔ یہ ہے ڈاکٹر شُکل کی شکایت جو وہ اپنی سچترا پرامانک اتہاس میں بیان کرتے ہیں۔

ہمیں بابر نامہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خاموشی کا یہ عرصہ دراصل ۲/ اپریل 1528 سے ۱۸/ ستمبر 1528 تک کا ہے نہ کہ ۲/ اپریل 1527 سے۔ یہ نام نہاد گم شدہ عرصہ صرف ساڑھے پانچ مہینوں کا ہے جس میں ڈھائی مہینہ برسات کے موسم کا ہے۔ (یہ عرصہ ساڑھے سترہ مہینوں کا نہیں جیساکہ ڈاکٹر شُکل سمجھتے ہیں) ان کے تعصب کی بنا پر ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ ڈاکٹر شُکل کی یہ غلطی اتفاقی نہیں بلکہ جانی بوجھی ہے۔

ڈاکٹر شُکل کی دوسری غلطی اس بیان پر ہے کہ ایسے ہی سیاہ ستون ملک میں کہیں بھی اور مستعمل نہیں ہیں۔ علاوہ اس بات کے

کہ اس قسم کے ستون دوسرے جین مندروں میں ہیں (جن کی تفصیل باب "سیاہ ستونوں کا زمانہ" میں دی گئی ہے) ایسے سیاہ ستون سمبھل اور پیلکھانہ کی جامع مسجدوں اور دھولپور کی ایک اور مسجد میں مستعمل ہیں۔

ڈاکٹر شکل کی تیسری غلطی اس سوال کے اٹھانے پر ہے کہ "جب بابر نے پورے ملک میں کہیں بھی کوئی مسجد نہیں بنائی تو یہاں ایودھیا میں ایک مسجد بنانے کی کیا ضرورت تھی"۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اوپر بیان کی گئی تینوں مسجدیں اور ملک بھر میں چھپے اور مسجدیں بابر کے نام سے منسوب ہیں۔

جب ہم تاریخی ثبوتوں کے ساتھ بابر کے خلاف بابری مسجد پر لگائے گئے الزامات کی تردید کرتے ہیں تو اُن سے کوئی جواب بن نہیں پڑتا۔ اس لئے یہ لوگ پھس پھسے اور سطحی نتیجے نکالتے ہیں اور کھوکھلے پن کے ساتھ اپنے جملے "ایسا کہا گیا ہے" "ایسا معلوم ہوتا ہے" جیسے محاوروں کے ساتھ شروع کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تاریخ کے ساتھ جعلسازی کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن ایک مستند مورخ ہیرالڈ لیمب لکھتے ہیں۔ "بابر نے ہندو مندروں کو بگاڑنے یا تباہ کرنے کی کوشش نہیں کی"۔

India's sacred shrines and cities اپنی (ہندوستان کے مقدس مقامات اور شہر) میں جے۔ لے۔ نیٹشن نے یہ لکھنے کی جسارت کی ہے کہ "جب بابر 1520 عیسوی میں یہاں آیا تو اس نے مندر کو مسمار کروایا اور اس کی جگہ ایک مسجد تعمیر کروائی جو آج بھی موجود ہے اور بابری مسجد کہلاتی ہے"۔

1520 میں بابر نہ سیالکوٹ سے آگے بڑھا تھا اور نہ

ہندوستان میں داخل ہی ہوا تھا۔ السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا (6-12، اپریل 1986) کے ایک مضمون "opening the flood gates" میں وشوا ہندو پریشد کے حوالے سے سر الکسنڈر کننگھم کا ایک بیان لکھنؤ گزیٹر کے حصہ 36 صفحہ 3 کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ مضمون اور اس کا ماخذِ وشوا ہندو پریشد کا مضمون ہندو نازی چرچے کا ایک نمونہ ہے۔ اس سے ان کی تاریخی دستاویزوں کی توڑ موڑ اور جھوٹ بولنے کی "ہمہ وقت تیاری کی صلاحیت" کا اظہار ہوتا ہے۔

سر الکسنڈر کننگھم کے نام سے جوڑا گیا جملہ یہ ہے:

"ایودھیا کے مشہور جنمستھان مندر کو ڈھانے کے لئے جنگ کئی دن تک ہوئی۔ تقریباً 1.74 لاکھ ہندو خونریز جنگ میں مارے گئے۔ لیکن باقی خان مندر میں داخل نہ ہوسکا۔ اور صرف توپ خانے کے استعمال کے ذریعے اسے تباہ کرسکا۔"

شیر سنگھ کے ساتھیوں نے تلاش و تحقیق کی اور لکھنؤ گزیٹر کے حصہ نمبر 36 کے اندر یوں پایا کہ سر الکسنڈر کننگھم کے حوالے سے دیا گیا یہ جملہ اس میں موجود نہیں ہے۔ پھر انہوں نے سر الکسنڈر کننگھم کی coins of Madieval India میں تلاش شروع کی۔ جہاں بابر کی رانا سنگھا کے ساتھ لڑائی کا ذکر تو ہے، لیکن بابر کے ایودھیا پر حملے کا ذکر نہیں۔

اس قسم کے جھوٹے پروپیگنڈہ کے باعث نازی ایک ایسا ماحول پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں کہ جس کے اثر سے چند کمزور دل مسلمانوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ مسلمانوں کو بابری مسجد پر اپنے حق سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ ہندو نازی بھیڑیا

مطمئن نہیں ہوگا۔ اس نازی چرچے کے پلندے کے مواد کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اچھی طرح سمجھ میں آجاتا ہے کہ نازی بھیڑیا مسلمانوں کے خون میں بے انتہا لذت محسوس کر رہا ہے۔

---

(۱۳)

بابر اور گرُو نانک

پہلے سِکھ گرُو سری گرُو نانک دیوجی نہ صرف بابر کے ہم عصر تھے بلکہ بابر کے سخت ترین نقّاد بھی۔ گرُو نانک (1469 تا 1538) عُمر میں بابر سے چودہ سال بڑے تھے۔ اور بابر کی موت کے بعد بھی نو برس زندہ رہے۔ گرو نانک نے 1505 میں اپنے نئے مذہب کی تبلیغ کے لئے سفر شروع کئے۔ اسی سال بابر نے کابل فتح کیا۔ اپنے چند اشعار میں جن میں کچھ سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب میں موجود ہیں، بابر کے متعلق غصہ اور حقارت بھرے اشارے ہیں:

تو نے ہندوستان میں دہشت پھیلا دی ہے
تو نے یم (موت کا دیوتا) کو بابر کے بھیس میں بھیج دیا ہے
قتل و خون بڑا زبردست ہُوا ہے
اگر ایک بڑی طاقت بڑی طاقت سے ٹکراتی ہے
تو غمگین نہیں ہوتی نہ شکایت کرتی ہے
لیکن جب خونخوار شیر مجبور بستیوں پہ لپک پڑیں
تو اے چرواہے! تجھے ہی جواب دینا پڑے گا

اے خدا تیرے طریقے کون سمجھ سکتا ہے

عجیب ہیں تیرے طریقے عجیب ہیں تیرے فیصلے

کوئی بھی ہندوستان میں اطمینان کے ساتھ کھا نہیں سکتا

اس لئے کہ مسلمان عورت کی نماز کا وقت گزر چکا ہے

ہندو عورت کے لئے پوجا کا وقت ہو چکا ہے

آہ ! نانک مرد بھی کتنے مجبور ہیں !

یہ صرف اللہ کی رضا ہے جو ہمیشہ ہمیشہ چلتی ہے

تلوار چمکی اور ٹکرائی

مغل نے نشانہ لگایا اور گولی چلا دی

پٹھان اپنے ہاتھیوں پر سے لڑ گئے۔

پیروں اور درویشوں نے دُعائیں کیں

اُمید دلاتے رہے کہ حملہ آور کو اندھا کر دیں گے

لیکن بابر بڑھتا ہی گیا

ان کے محلوں کو جلاتا ہُوا زمین بوس کرتا ہُوا

امراء کی اس نے دھجیاں اُڑا دیں

ان کے سر دُھول میں لڑھکنے لگے

پیروں کے ٹونے ٹوٹکے بے کار ہو گئے

ہندو، تُرک، بھٹی، راجپوت سپاہیوں کی بیویوں نے

مایوسی میں اپنے گھونگھٹ پھاڑ ڈالے

خدا کی ایسی ہی مرضی ہے

وہی ان سب کے اسباب کو جانتا ہے

ان سب مصرعوں کو گرو نانک کے مختلف اشعار سے

نمونے کے طور پر لیا گیا ہے۔ دکھانا یہ ہے کہ انہوں نے بابر کا کس انداز میں ذکر کیا ہے۔ دو نکتے خاص طور پر غور طلب ہیں:

۱) گرو نانک شکایت کرتے ہیں کہ بابر کی فوجی کاروائیوں کے دوران عام طور پر ہر طبقے کو تکلیف پہنچی ہے اور اس کے لئے کوئی ایک فرقہ مخصوص نہیں ہوا۔ ۲) گرو نانک کہیں بھی اس بات کی شکایت نہیں کرتے کہ کوئی بھی مندر یا کسی بھی فرقے کی عبادت گاہ بابر کے ہاتھوں ڈھائی گئی۔

تواریخ گرو خالصہ کے مصنف بھائی گیان سنگھ کے بیان کے مطابق گرو نانک ایودھیا بھی گئے تھے۔ اور کیلاش، کاٹھمنڈو، سکم، اور نیپال کے ترائی علاقے کا بھی دورہ کیا۔ چونکہ یہ بابر کی موت کے بعد بھی نو برس تک زندہ رہے تو یقیناً بابر کے ہاتھوں ایودھیا میں ڈھائے گئے مندر کا علم انہیں ہوتا۔

1528 میں بابری مسجد کی تعمیر ہوئی ہے۔ اگر گرو نانک اس سال کے بعد بھی ایودھیا گئے ہوئے تو بھی اس بات کا علم ان کو ہوا ہوتا۔ اس لئے کہ بنیادی طور پر وہ مذہبی رہنما تھے اور بابر کے سخت نقاد بھی۔ ان کے پیرو ہر جگہ موجود تھے۔ بابر کی تضحیک میں وشوا ہندو پریشد بھی یقیناً گرو نانک سے بازی نہیں لے جاسکتی۔ کلی طور پہ بابر کی پوری زندگی کے تمام اہم واقعات کے گرو نانک چشم دید گواہ ہیں: اور اگر بابر نے واقعی کوئی مندر ڈھا دیا ہوتا تو اس پہ جرح کرنے کا موقع گرو نانک کبھی نہ ضائع کرتے۔

ایک ضروری نکتہ جو گرو نانک جیسے مذہبی رہنما کے ہاتھوں لکھی گئی تحریر کی روشنی میں قابلِ غور ہے۔ وہ یہ کہ ہندوستان میں

جنگیں دو سیاسی قوتوں کے درمیان ہوئی ہیں دو مذہبی جماعتوں کے درمیان نہیں۔ بابر کی فوج میں مغل، پٹھان اور ہندو سب شامل تھے۔ طاقتور مسلم حکمرانوں کے بسا اوقات ہندو فوجی سردار ہوتے تھے۔ وفاداری ہر وقت حکمران یا علاقے کے ساتھ ہوتی تھی اور مذہب سے بالکل نہیں ہوتی تھی۔ سرکاری معاملات میں مذہب کی مداخلت حالیہ پیداوار ہے۔

---

(۱۴)

بابر کا حکمنامہ ـ ایک جعلسازی

ایک اور ہندی کتاب جو "ہندوؤں" کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کے لئے وشوا ہندو پریشد کی شائع کردہ ہے "اتیت کی اہوٹن ـ ورتمان کے سنکلپ" ہے۔ اس میں ایک حکمنامہ ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ بابر کا جاری کردہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ایودھیا میں داخل ہونے والے "ہندوؤں" کو گرفتار کر لیا جائے اور قید کیا جائے۔ اس حکمنامہ کا ابتدائی جملہ یوں ہے۔ "بحکم شہنشاہِ ہندوستان ـ تمام جہاں کے مالک ـ بابرؒ" اس حکمنامے میں تقریباً 120 الفاظ ہیں۔

شیر سنگھ کی جماعت (تمہید دیکھئے) نے وینکٹ لال شرما سے یہ جاننا چاہا کہ اس حکمنامے کا اصل نسخہ کہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کا جواب نہیں دیا گیا۔ شاید یہ بہت چالاک ہیں۔ جماعت نے ڈاکٹر شکل کی طرف رجوع کیا اس لئے کہ انہوں نے بھی اپنی کتاب "پرمانک اتہاس" میں

اس کی نقل کی ہے۔ ان سے معلوم ہوا کہ یہ حکمنامہ شاہی مہر کے ساتھ سوامی ستیا دیو پریورجک نے مغل دور کے کاغذات کی تلاش کے دوران دیکھا تھا اور انہوں نے اس کو انگریزی رسالہ Modern Review مورخہ 6 جولائی 1924 میں شائع کروایا۔

ان ایماندار مورخوں (پرامانک اتہاس) کو یہ اُمید نہ تھی کہ شیر سنگھ کی جماعت اس رسالے کے مذکورہ قدیم شمارے کی تلاش کر پائے گی اور ان کی دھوکہ بازی ظاہر ہو جائے گی۔ ماڈرن ریویو کا یہ قدیم شمارہ نیشنل لائبریری، انیکس بلڈنگ، علی پور، کلکتہ میں موجود ہے۔ اس کا کال نمبر Vol. 37 P. 1237 ہے۔ اس جماعت کی تحقیق بتاتی ہے کہ سوامی ستیہ دیو پریوراجک کا مذکورہ مضمون اس رسالے میں بالکل ہی شائع نہیں ہوا۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس مقام کے بارے میں پھر سے سوال کیئے گیئے جہاں یہ حکم نامہ موجود ہے اور یہ بھی کہ کہیں اور مقام پر یہ حکمنامہ موجود ہے تو ان لوگوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر تُنکل، وِشوا ہندو پریشد اور پنڈت رام گوپال پانڈے نے فرداً فرداً پڑھنے والوں کو غلط راستے پر ڈالنے کے لئے اپنے اپنے جوش کے مطابق اس میں زیادتی اور ترمیم کر لی ہے۔ شیر سنگھ کی جماعت نے ان تینوں کے بیان کردہ اُس جعلی دستاویز میں چھپے فاش متضاد غلطیاں پکڑ لی ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک ہوشیار پڑھنے والا ان میں اور زیادہ افتراقات پا سکے گا۔

ان افتراقات پر بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ یہ دستاویز بنیادی طور پر جعلی ہے۔ اس میں ہم سب کے لئے ایک سبق ہے۔ اگر وشوا ہندو پریشد مسلم حکمرانوں کے خلاف کچھ کہتی ہے تو محفوظ راستہ یہ ہے کہ بالکل اُس کی ضد کو مان لیا جائے۔

(۱۵)

بابری مسجد کے سیاہ ستونوں کی عمر

ڈاکٹر شکل کہتے ہیں کہ سیاہ سنگین ستونوں والا مندر وکرمادتیہ یعنے سکنڈ اگپتہ نے بنایا تھا۔ لیکن اس بات کو ناقابلِ تسلیم سمجھنے کے لیئے دو نکتے ہیں جن پر عالموں نے زور دیا ہے اور خود ڈاکٹر شکل بھی اسے مانتے ہیں۔

(۱) مندروں کی تعمیر کا فن گپتا دور میں اپنے ابتدائی عالم میں تھا۔

(۲) گپتا دور کا کوئی مندر جس کے آثار ہمارے پاس موجود ہیں عالیشان نہیں مانا جا سکتا۔

ان ستونوں کو گپتا دور سے متعلق نہ ہونے کی بات کہنے والے عالموں کی منطق بالکل عاقلانہ اور قابلِ قبول ہے، لیکن ڈاکٹر شکل اس کی تردید کس طرح کرتے ہیں؟ وہ کہتے ہیں۔ "ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ رام مندر کا معمار گپتا شہنشاہ تھا، جو اپنے آپ کو اپنی طاقت کی بنا پر رام کے برابر سمجھتا تھا۔ یقیناً اس نے بہترین مندر تعمیر کروایا ہوگا"

(Sri Ram JAnambhomi صفحہ 9)

تکنیک کی غیر موجودگی میں کسی بادشاہ کی طاقت کیسے مددگار ہو سکتی ہے۔ محض اس لئے کہ پلیکیشی ثانی اتنا طاقتور تھا کہ اس نے شہنشاہ ہرش کو جنوب کی طرف سے پسپا کر دیا تھا، کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے دربار میں بہترین روشنی کا سامان تھا جبکہ اس وقت مٹی کے تیل اور پیٹرومیکس کا تصور ہی نہیں تھا۔ کسی بادشاہ کی غیر معمولی طاقت اور اختیارات اور چیزیں ہیں اور اُس کے تکنیکی حدود دوسری چیز۔

ان دونوں چیزوں کو ملا کر ڈاکٹر شکل نے پڑھنے والوں کی سمجھ بوجھ کی ہنسی اڑائی ہے۔

ودیا دھیجہ نے مندروں اور وِہاروں میں استعمال شدہ ستونوں کی ارتقا کے متعلق بحث کرتے ہوئے پانچ ادوار کا ذکر کیا ہے۔ قدیم ترین ستون پہلی صدی عیسوی کے ہیں۔ بابری مسجد میں مستعمل سیاہ سنگین ستون پانچویں دور سے متعلق ہیں جو گیارہویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے۔
(Early Budhist Rock Temples P. 81-88
by Vidya Daheja)

اس بات پر زور دیتے ہوئے کہ بابری مسجد کے ستون ہندو مندر سے لئے گئے تھے۔ ڈاکٹر شکل کہتے ہیں: "اس قسم کے سیاہ ستون صرف رام جنم بھومی میں ملتے ہیں اور ملک بھر میں کہیں بھی نہیں پائے جاتے"۔ (صفحہ ۱۵)

لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اس قسم کے سیاہ ستون سات سے زیادہ مقامات پر ہندوستان بھر میں موجود ہیں اور سب کے سب آٹھویں صدی سے دسویں صدی تک بنائے گئے ہیں۔

اسی قسم کے ستون ایسے ہی نقوش کے ساتھ راجستھان میں جودھپور کے قریب اوسیہ گاؤں کے مہاویر جین مندر، جینیوں کے سومیشور مندر، روڈا مندر اور ماروارپلی کے نولکھا مندر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایسے ہی ستون دوسری مسجدوں میں بھی استعمال کئے گئے ہیں جس کی تفصیل یہاں دوسرے باب میں دی گئی ہے۔

(صفحہ 53 Indian Archaeology – A Review
1976-77)

"ہندوستانی آثارِ قدیمہ – ایک تبصرہ" صفحہ 53 پر

چونکہ یہ کہا گیا ہے کہ بابری مسجد کے سیاہ ستون 1000 عیسوی کے آس پاس تراشے گئے ہیں۔ ڈاکٹر شکل کہتے ہیں کہ رام جنم مندر 1000 عیسوی کے نزدیک یا بعد میں بنایا گیا ہوگا۔ (رام جنم بھومی صفحہ 10) تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ سات صدیوں پہلے (382 تا 411) وکرمادتیہ یا سکندا گپتا یا چندر گپت ثانی نے اس کی تعمیر کی تھی۔ ڈاکٹر شکل کی بحث کا نچوڑ اور نتیجے مایوس کن اور کس قدر متضاد ہیں۔

جیسا کہ چوتھے باب میں پہلے ہی بتایا گیا ہے، گیارھویں صدی کے ایک سنسکرت شاعر سری لکشمی دھارا نے اپنی تیرتھا وویچنی کلپ میں اپنے دور کے پوجا کئے جانے والے دیوتاؤں کی فہرست دی ہے۔ اس فہرست میں رام کا نام نہیں ہے۔ اس نے ایودھیا یا رام جنم ستھان کے بارے میں بھی کچھ بیان نہیں کیا ہے۔

ڈاکٹر شکل اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ سری لکشمی دھارا نے ایودھیا (گیارھویں صدی) کا ذکر تیرتھ گاہ کی طرح بیان نہیں کیا ہے۔ اس لئے اس کج فہم بیان کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ رام مندر نہیں تھا۔ ہم تو بس اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر شکل صرف اس بات کو مانتے ہیں جس کو وہ ماننا چاہتے ہیں۔ پھر وہ ساتویں صدی کے ہوین سانگ کا حوالہ دیتے ہیں جس نے یہ رقم کیا ہے کہ یہاں دس دیو مندر اور ایک سو بدھ وہار تھے اور فوراً آگے چل کر کہتے ہیں: " اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہرش کے زمانے میں بہت سارے (اَن گِنت) دیو مندر تھے!! یہاں یہ جان بوجھ کر پڑھنے والے کو بہکانا چاہتے ہیں۔ ساتویں صدی کے ہوین سانگ درست بات کہتے ہیں اور مندر اور وہاروں کا تناسب 10 : 1 بتایا ہے۔ لیکن ڈاکٹر شکل کو تو بہت کچھ چھپانا تھا اور بتانے کے لئے بہت کم

تھا، ورنہ ان کو اس کڑوی حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا کہ دیومندر ان بدھ
وِہاروں کے کھنڈرات پر بنائے گئے جن کو آدی شنکرا کی ہدایت
کے تحت یا ویدک مذہب کو ماننے والے راجاؤں کے ہاتھوں ڈھا دیا گیا تھا۔

میگاستھنیس کے مطابق جس کو یونان کے بادشاہ سیلیوکس
(301 تا 298 ق۔م) نے چندرگپتا موریہ کے دربار میں بھیجا تھا،
ہندوستان میں شہروں اور محلوں کی تعمیر ندیوں کے کنارے بلند مقامات
پر ہوتی تھی، محل لکڑی کے بنائے جاتے تھے اور عام لوگ دھوپ میں
پکی ہوئی اینٹوں سے گھر بناتے تھے۔
(Cambridge History of India صفحہ 369
Vol I, E.J. Rapson)

ڈاکٹر تنکل کو اس بات پر غور کرنا چاہئے تھا کہ تعمیرات کی تکنیک
کو بابری مسجد میں استعمال کئے ہوئے سنگین ستونوں کے دور تک پہنچنے
میں کتنا وقت لگا ہوگا۔

(۱۶)

بابری مسجد اور سکھوں کے گرو

گرو نانک کا سکھ مت برہمنی مذہب کے خلاف ایک احتجاجی مذہب کے روپ میں نمودار ہوا۔ اور گرو نانک نے ذات پات کی علامت زُنّار اور تلک کی مذمت کی تھی۔ لیکن سکھوں کے نویں گرو، گرو تیغ بہادر نے کشادہ دلی اختیار کی اور تعلیم دی کہ تمام مذاہب والے، ہندو، مسلمان اور سکھ اپنے اپنے مذہب کے اصولوں پر عمل کرنے میں آزاد رہیں۔ (ڈاکٹر اے سی بنرجی: گرو نانک سے گووند سنگھ تک) - اپنی "تواریخ گرو خالصہ" میں بھائی گیان سنگھ لکھتے ہیں کہ گرو تیغ بہادر 1672 میں ایودھیا گئے تھے اور انہوں نے یہاں برہما گھاٹ پر چلّہ کیا تھا اور یہ مقام بابری مسجد سے کچھ چار سو میٹر دوری پر ہے اور یہاں سے بابری مسجد صاف نظر آتی ہے۔

اگر واقعی بابر نے مندر کو تباہ کرنے کے بعد اس کے مقام پر بابری مسجد کی تعمیر کی تھی اور اورنگ زیب نے ایودھیا پر حملہ کیا تھا جیسا کہ ڈاکٹر شکل کا بیان ہے تو کیا گرو تیغ بہادر ان واقعات کا ذکر کئے بغیر رہتے؟ گرو تیغ بہادر کی تحریریں گرنتھ صاحب کا حصہ ہیں اور ان تحریروں میں ان مبیّنہ واقعات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے خود گرو تیغ بہادر کے قتل کا حکم دیا تھا اور گرو کو ۱۱ر نومبر 1675 کے دن دہلی میں تہہ تیغ

کیا گیا تھا۔ ہم کو سکھ ریویو (جنوری 1976 صفحہ 29 اور 51) سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب اس مخصوص دن دہلی میں موجود نہیں تھے۔ وہ 6 جولائی 1674 کے دن پشاور کے قریب حسن ابدال گئے ہوئے تھے اور یہاں ڈیڑھ سال مقیم رہنے کے بعد مارچ 1676 دہلی واپس ہوئے۔

سکھ مت کے بانی گرو نانک جس کسی بھی مقام کو گئے ہیں وہ سکھوں کے لئے مقدس ہے اور بعد کے تمام گروؤں نے ان مقامات کی زیارت کی ہے۔ گرو نانک ایودھیا گئے تھے۔ اس لئے گرو تیغ بہادر اور ان کے بیٹے اور دسویں گرو، گرو گووند سنگھ بھی ایودھیا گئے۔ تواریخ گرو خالصہ میں گرو کے ایودھیا پہنچنے کا ذکر اس طرح ہے:

"پریاگ میں پانچ دن قیام کرنے کے بعد گرو جی ایودھیا کے لئے نکلے۔ راستے میں انہوں نے بہت لوگوں کو تعلیم دی اور ایودھیا پوری میں وششٹ کنڈ میں قیام کیا۔ انہوں نے سورگ دواری گھاٹ پر غسل کیا اور گپتر گھاٹ کی زیارت کی۔ وہ ہنومان گڑھی، رام چندر ستھان اور سیتا سے متعلق مقامات پہنچے اور بہت سارے سادھوؤں سے ملاقات کی"۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج کل جنم ستھان کہلانے والا مقام (جو بابری مسجد کے شمال میں ہے) گرو گووند سنگھ کے زمانے میں رام چندر ستھان کہلاتا تھا۔ اگر جنم ستھان وہی مقام ہے جہاں بابری مسجد تعمیر ہوئی ہے تو انہوں نے مسجد کی زیارت کی نہ کہ رام چندر ستھان کی۔ ان سب سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان کے زمانے (سترھویں صدی) میں بابری مسجد سے متعلق کسی بھی قسم کے تضاد کا شائبہ بھی نہ تھا۔ سن 1528

بروز اتوار 2 فروری 1528 عیسوی، بابر ملا خان تالاب سے

شمال کی طرف چندیری کے لئے روانہ ہُوا۔ 22 فروری کے دن گونار کی نہر تک پہنچا اور کشتیوں کے ذریعے پار ہُوا۔

اس میں کوئی تضاد نہیں ہے کہ بابری مسجد کی تعمیر 1528 میں ہوئی تھی۔ اس سال کے واقعات چار کتابوں سے اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ خود بابر کا لکھا ہُوا "بابر نامہ" اور بابر کی بیٹی گلبدن بیگم کے لکھے ہُوئے "ہمایون نامہ" کا انگریزی ترجمہ جو مسز اینیٹ سوسنّا بیورج نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ دو کتابیں سٹینلی لین پُول کی "رُولرس آف انڈیا۔ بابر" اور ولیم ایرسکن کی "بابر اور ہمایون کے ہندوستان کی تاریخ"۔ آیئے دیکھیں کہ بابر کی زندگی کے سن 1528 میں کیا کیا واقعات گذرے۔

مارچ 1528 میں بابر افغانوں کے ساتھ جنگ میں اُلجھا رہا۔ مارچ کی 13 تاریخ کو پنجاب کے پُل کی تعمیر پُوری ہُوئی۔ اس کے دوسرے دن بابر کی فوج ندی کے اُس پار اُتری اور جنگ میں اُلجھ گئی۔ افغانوں کا پیچھا شدت کے ساتھ اودھ (ایودھیا) کے صوبے تک کیا گیا اور افغان فوج پوری طرح بکھر گئی۔ ولیم ایرسکن کے الفاظ میں "مکمل فتح ہُوئی"۔ 16 مارچ 1527 کے دن کنوا میں بابر کو رانا سانگا پر فتح ہوئی۔ گلبدن بیگم کے مطابق وہ ماہم کے ساتھ 1528 کی گرمیوں میں آگرہ پہنچی۔

ولیم رَس بروک کے مطابق چونکہ بابر نے آگرہ سے چار میل دور ان سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کی تاریخ اپریل 1528 کے 5 اور 10 میں پڑتی ہے۔

(The Empire Builder of 16th century
Page 165)

بابرنامہ کے مطابق 28 مارچ سے 2 اپریل 1528 تک (6 دن) بابر نے اس مقام پر قیام کیا، جہاں گوگرا اور سریو ندیاں ملتی ہیں یعنی ایودھیا سے ۱۱۵ کلومیٹر کے فاصلے پر۔ ایودھیا یا اودھ کے صوبے (شہر ایودھیا میں نہیں) کے اس قیام کے دوران بابر نے صوبے کے کچھ معاملات طے کئے۔

پھر اس کے فوراً بعد بابر آگرہ واپس ہوا۔ اس لئے کہ گرمی شدت اختیار کر گئی تھی اور برسات کا موسم بالکل قریب ہو رہا تھا۔ گرمیوں اور برسات کے دن آگرہ میں گزارے گئے۔

۱۰ / جولائی 1528 کے دن بابر اپنی بیٹی گلبدن بیگم کے ساتھ آگرہ سے دھولپور کے لئے روانہ ہوا۔ یہاں اس نے تالاب کے درمیان ایک چبوترہ تعمیر کرنے کا حکم دیا تاکہ ٹھنڈی ہواؤں کا لطف اٹھایا جائے۔ یہاں بابر نے (اپنی سوانح حیات) کی تحریر کا کام کیا۔ یہاں سے بابر اور اس کی بیٹی آگرہ واپس ہوئے۔ 18 ستمبر 1528 کے دن بابر نے آگرہ سے گوالیار کے لئے نکلنے کی تیاری کی۔

(۱۷)

بابر کا سیکولرزم اور ہندو

تیرھویں باب میں گرو نانک کی تنقید یہ بتانے کے لئے لکھی گئی تھی کہ بابر کے سخت ترین نقاد نے بھی اس پر بُت شکنی اور تعصّب کا الزام نہیں لگایا ہے۔ سٹینلی لین پول، آر سی مجومدار اور یس کے بنرجی جیسے عالموں کی تحریروں سے بابر کی جو تصویر ملتی ہے وہ گرو نانک کی بتائی ہوئی تصویر سے بالکل الگ ہے۔ اتنا گہرا اور وسیع اختلاف، ایک مذہب کے بانی اور حکومت کے بانی، ایک سپاہی اور ولی، ایک حاکم اور مبلّغ کے درمیان ہونا لازمی ہے۔

ہزاروں۔ غلطیوں اور بحث سیوں سے جنگوں کے بعد بابر تھکا ہارا قلات پہنچا۔ قلات میں اس کے آدمیوں نے چند ہندو تاجروں کو پکڑ رکھا تھا۔ انہوں نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس قسم کے حالات میں غیر ملکی تاجروں کو لُوٹ لینا غلط نہیں ہے۔ لیکن بابر نے اس کو قبول نہیں کیا۔ اُس نے دریافت کیا کہ "ان لوگوں نے ایسا کونسا جرم کیا ہے۔ اگر خدا کی محبت میں ہم ان معمولی سی مشکلات پر قابو پالیں تو خدا ہمیں ایک دن بہت بڑی اور قابلِ قدر نعمتوں سے نوازے گا۔"

(The Self Revelation of Babar:

A. Yusuf Ali)

بابر حریص نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو قلندر کہتا تھا اور اس لقب سے خوش ہوتا۔ (قلندر اس فقیر کو کہتے ہیں جو دولت اور

مذہبی اعتقادات کی پرواہ نہیں کرتا) اس کے معتمد سفیر زیادہ تر ہندو ہی تھے۔ دیوا بن پسکتو نامی ایک ہندو نے بابر اور دولت خان کے بیٹے علی خان کے درمیان 1519 میں مذاکرات کروائے تھے۔ پھر کرم چند نامی ایک ہندو نے بابر اور حسن خان میواتی کے بیٹے نہار خان کے درمیان بات چیت کی تھی۔ کھنوا کی جنگ میں حسن خان کے مارے جانے کے بعد بابر نے اس کو عظیم جاگیر عطا کی تھی اور بہت سارے شاہی انعامات سے سرفراز کیا تھا۔ ہاموشی نامی ایک اور ہندو، بابر کا سفیر تھا، جس کے تفویض بابر نے سفارتی ذمہ داریاں سونپ رکھی تھیں۔

راجپوتوں کے ساتھ بابر کے تعلقات اس کے ہندوستان آنے سے بہت پہلے ہی سے تھے۔ 1525 میں جبکہ بابر کابل میں تھا اس کے اور رانا سنگھا کے درمیان بات چیت ہو چکی تھی اور ایک دوسرے کے تعاون کے وعدے ہو چکے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ بابر رانا کی دعوت پر ہی ہندوستان آیا تھا اور اس کا مہمان رہ چکا تھا۔ بابر کو ابراہیم لودھی کے مقابلے میں، کالپی، دھولپور، بیانہ اور آگرہ کی فتح کے سلسلے میں دی گئی مدد پر رانا کو بہت سارے انعامات کی توقع تھی۔ یہاں بھی رانا کا نمائندہ ایک ہندو سلہدی تھا جس نے بابر کے ساتھ معاملات طے کیے تھے۔ رانا کے مطالبے اتنے سخت تھے کہ سلہدی رانا کو چھوڑ کر بابر کے ساتھ مل گیا اور بعد میں رانا کے ساتھ ہونے والی جنگوں میں بابر کا ساتھ دیتا رہا۔

جب رانا بابر کے خلاف ایک اور جنگ کے لئے تیار ہو گیا تو خود اس کے وزیروں نے محسوس کیا کہ یہ ایک اور سخت اور لاحاصل کوشش ہوگی۔ انہوں نے رانا کو زہر دے کر مار ڈالا۔ لیکن نازی ہندو

چرچے باز ان حقیقتوں سے گریز کر رہے ہیں اور رانا سانگا کو محب وطن اور ہندومت کے محافظ کے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔

جس انداز سے بابر نے ان ہندو جوگیوں کی ہمت افزائی کی جن کے چیلے مسلمان تھے، اس سے بابر کی وسعتِ قلب اور غیر جانبدارانہ نظریوں کا اظہار ہوتا ہے۔ گوالیار کے قلعے کا ایک دروازہ ہاتھی پول اس لئے کہلاتا ہے کہ اس کے ایک بازو میں ایک ہاتھی کا سنگین مجسمہ ہے۔ بابر اس مجسمے کی بڑی تعریف کرتا تھا۔

وہ اسباب جن کی بنا پر بابر نے ڈگمبر جینی رشیوں کے ننگے مجسموں کو توڑنے کا حکم دیا تھا چھٹویں باب میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہ بات کہ بابر میں بُت شکنی کے جذبات نہ تھے اس بات سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس کے فوراً بعد وہ ہندو مندروں کی زیارت کے لئے چل پڑتا ہے۔ بابر نے گوالیار کے اُن مندروں کا ذکر اتنی تفصیل کے ساتھ کیا ہے کہ اس سے اس کی گہری نظر اور ذوقِ نظر کا پتہ چلتا ہے، اور ایک ممتاز حکمران کے ذوق کا اظہار ہوتا ہے۔

سب سے اہم دستاویز جس سے بابر کی سیکولرزم پر یقین اور ہندوؤں پر مہربانی کا اظہار ہوتا ہے، اس کا وصیت نامہ (وصیت نامۂ مخفی) ہے جس پر سے ین سی مہتا نے پردہ اُٹھایا ہے۔ یہ بھوپال کی سٹیٹ لائبریری میں آج کل محفوظ ہے۔ اس میں اپنے بیٹے ہمایون کو یوں نصیحت دی گئی ہے۔ "اپنے دل کے ہر گوشے سے مذہبی تعصب کو دھو ڈالو۔ انصاف ہر جماعت کے اُن کے اُصولوں کے مطابق کرو۔ خاص طور پر گائے کی قربانی سے پرہیز کرو۔ اس لئے کہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے اہلِ ہند کا دل جیتا جا سکتا ہے۔ اس بات کا خیال رکھو کہ اس ملک کی رعایا شاہی انعامات

کے باعث تخت سے بندھی رہے اور مندروں کی اور دوسری قوموں کی عبادت گاہوں کی کبھی توہین نہ کرنا۔ اور مختلف مذاہب کے پیروؤں میں باہمی اُلفت ڈال دو"۔

بابر ہندو مندروں کو فراخ دلی سے چندہ دیتا تھا۔ ایودھیا کے دانت دھون کنڈ کے آچاریہ سوامی شتروگھن کو اس نے 500 بھیگہ (167 ایکڑ) زمین عنایت کی اور اس کی دستاویز آج تک ان کے وارثوں کے پاس موجود ہے۔ رام رکشا ترپاٹھی رندہیک نے ایک لمبی فہرست ان مندروں کی دی ہے جن کو چندے دئے گئے، جن میں ایودھیا کے بھی چند مندر موجود ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شہنشاہ زمینات اور روپیہ تو چند مندروں کو عنایت کرتا ہو اور اسی شہر کے کسی اور مندر کو توڑ دیتا ہو۔ یہ تفصیلات ان کتابوں سے لی گئی ہیں:

بابر اور ہندو از بیس کے بنرجی۔ بابر ڈیرسٹ اینڈ ڈسپاٹ از ایس یم ایڈورڈس اور تاریخ شاہی از احمد یادگار۔

شیر سنگھ کے ساتھیوں نے ایک درجن سے زیادہ مسلمان حکمرانوں کے دئے گئے شاہی احکامات جمع کئے ہیں جن کے ذریعے زمینات اور سونا ایودھیا کے ناگیشورناتھ مندر کو دئے گئے ہیں۔

اِس کو شرارت بر شرارت کہنا ہوگا کہ بابر کو بُت شکنی کے جذبات سے صاف اور فراخ دل انسان کے روپ میں پیش کرنے کے بعد بیس کے بنرجی بغیر کسی ثبوت کے بابر پر الزام لگاتے ہیں کہ اس نے ایودھیا کے جنم استھان کے مندر کو مسمار کرنے کا حکم دیا۔ بیس کے بنرجی کا ذہن ایک ایسے مقید ذہن کی بہترین مثال ہے جس کی نفسیات اس کو اُسی بات کے قبول کرنے پر مجبور کر دیتی ہے جس کو وہ ماننا چاہتا ہے۔ جیساکہ

دلیت وائس کے ایڈیٹر وی ٹی راج شیکھر اس ذہنیت کو اکثر پیش کرتے رہتے ہیں۔

غور کیجئے کہ یس کے بنرجی کیا کہتے ہیں:

"مسلمانوں کے تمام فرقوں کو اور ہندوؤں کو بھی عبادت کی پوری آزادی دی جانی چاہیئے۔ ہندوؤں کے مندر کسی بھی حالت میں نہ توڑے جائیں، نہ اُن کی تضحیک ہو۔ رام جنم استھان کا مندر اس کے ایک حد سے زیادہ جوشیلے افسر کے ہاتھوں شہنشاہ کی اجازت کے بغیر، اس کی حکومت کے ایک نازک موقع پر توڑ دیا گیا۔

میر باقی نے مذہبی جوش کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اور ایودھیا (جنمستھان) کے مرکزی مندر کو مشرق کی طرف کوچ کرتے ہوئے ڈھا دیا۔ اس کے بعد اس نے شہنشاہ سے اجازت لے لی اور مسجد تعمیر کی"!

ہمیں یہ معلوم نہیں کہ یس کے بنرجی کو آخر کس بات نے یہ کہنے سے روک دیا کہ مسجد اسی مقام پر بنائی گئی جہاں مندر ڈھایا گیا تھا۔ ان کا بابر پر الزام لگانے کا انداز ایسا ہے کہ بابر نے گویا مندر کے ڈھائے جانے کے عمل کو تسلیم کر لیا۔ ان کی تکنیک یہ ہے کہ جس آدمی کو بدنام کرنا ہے اس کی پہلے تعریف کی جائے تاکہ اس سے اپنی انصاف پسندی ظاہر ہو جائے۔ پھر مخصوص نکتے پر بغیر کسی بنیاد کے بہتان لگا دیا جائے۔ ان کی ذہنی عداوت اتنی گہری ہے کہ وہ "جملہ طبقوں کے مسلمانوں" کا تذکرہ یوں کرتے ہیں گویا مسلمانوں میں آپس میں سخت مخالف طبقے تھے۔

جیسا کہ آٹھویں باب میں بتایا گیا ہے۔ مشہور ماہرِ آثارِ قدیمہ میجر جنرل الکسنڈر کننگھم نے 1862 اور 1865 میں بھی ایودھیا میں رام جنم ستھان کو باقی اور موجود دیکھا تھا جیسا کہ آکیولوجکل سروے آف انڈیا سے

رپورٹوں میں موجود ہے۔ یہ مندر بابری مسجد کے شمال میں موجود ہے۔ ایک پکی سڑک مندر اور مسجد کو علیحدہ کرتی ہے۔ مندر کے مرکزی دروازے پر دیوناگری میں لکھے ہوئے سنگِ مرمر کے ایک کتبہ پر یہ لکھا ہوا ہے:

" جنم ستھان — ہر روز کی زیارت گاہ

جنم ستھان — سیتا کی رسوئی

چیئرمین مہنت سری ہری داس جی "

" بابر نے — مندر — کو — ڈھا دیا " کا مفروضہ محض جھوٹ پر بنایا گیا ہے۔ اس لئے کہ جنم ستھان مندر اپنی جگہ موجود ہے جس کو ہر کوئی دیکھ سکتا ہے۔

---

(۱۸)

بابر کا مذہبی رجحان

بابر اوائلِ عمر ہی سے خطرناک مہمات کا دلدادہ تھا جس کے سبب وہ کتنی ہی مشکلات میں پھنس جاتا تھا۔ کبھی اسی سودے میں اُسے اپنی زندگی اپنی بہن خانزادہ بیگم کو رہن رکھ کر شیبانی خان سے حاصل کرنی پڑی تھی۔ شیبانی خان سے اُس کے ایک بیٹا ہوا جو بعد میں خرم شاہ سلطان کے نام سے مشہور ہوا۔ پھر شیبانی خان نے سید ہادی کے ساتھ اس بیگم کو رہنے کے لئے کہا۔ سید ہادی کی 1510 میں مرو کی جنگ میں موت واقع ہوئی۔ پھر بیگم اور اس کا بیٹا شاہ اسماعیل صفوی کے ہاتھ لگے۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ بابر کی بہن ہے تو اس نے اس کے ساتھ عزت کا برتاؤ کیا اور بابر کے پاس واپس بھیج دیا۔

بابر اس شیعہ شہنشاہ صفوی کے اس نیک برتاؤ سے اتنا متاثر ہُوا کہ اس) نے اس کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ اس معاہدے کی ایک دفعہ یہ تھی کہ بابر شیعوں کے بارہ اماموں کی تصویروں کی مُہر بنائے اور خود کے لئے ایک شیعہ لباس اختیار کرے۔ یہ تفصیلات انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں بی لوئیس چارلس پلاٹ اور جے شاشٹ نے دئے ہیں۔ یہ تفصیلات مسز سریندر کور نے ان اسباب کے اظہار کے لئے دی ہیں کہ کس لئے بابری مسجد کے سیاہ ستونوں میں چند نقوش موجود ہیں اور بابر کا شیعیت کی طرف مائل ہونا ان نقوش کا باعث ہے۔ سریندر کور بابر کے جاری کردہ ان سکوں کا بھی ذکر کرتی ہیں، جن پر انسانی نقوش کھدے ہُوئے ہیں جو آج بھی برٹش میوزیم میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسانی نقوش بنانا، بتوں کی شکل یا تصویروں کا اعزازی طور پر بھی بنانا اسلام میں منع ہے۔ کائنات پر حاوی، لامکاں، اَن دیکھے اور بے جسم، ہر جا موجود، لامحیط، نادید و بے جسم خُدا کی عبادت کا تصور دینے والے مذہب میں کسی بھی ظاہری شکل کا اظہار ناممکن ہے۔ اسلام عظیم ترین انسانوں کی بھی تصویروں کے بنانے کو برداشت نہیں کرتا، چاہے وہ حضرت محمدؐ کی ہی کیوں نہ ہو۔ (نعوذ باللہ)۔ عشق میں ڈوب کر بھی، بت پرستی یا بت نصب کرنا، بت گری اور انسانوں کی تصویر کشی اسلام کے خلاف ہے۔ اسلام نے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کھلے طور پر بتا دیا ہے کہ مسلمان دوسرے مذہبوں کے اعتقادات اور عبادات میں کسی طرح کی بھی مداخلت نہیں کریں گے۔ (لکم دینکم ولی دین) اس لئے مسلمانوں نے شاعری کے ذریعے وہ سب کر لیا جس کی مصوری اور سنگ تراشی کے ذریعے کرنے کی ممانعت کی گئی۔ برش، کینوس اور تختی کے عوض مسلمانوں نے قلم تھام لیا اور شاعری کی۔ حسن و عشق

عربی، فارسی اور اُردو جیسی مُسلم زبانوں کے پسندیدہ عنوان بنے،
جس میں شاعری کی ایک نئی صنف بنائی گئی جو غزل کہلاتی ہے اور
یہ زبانیں اس صنفِ سخن میں بلندیوں کی انتہا پر پہنچ گئیں۔

لیکن جب چنگیز خاں کی ہدایت میں منگولوں نے مسلمانوں کی
مرکزی قوت کو تیرھویں صدی میں تباہ کر دیا اور وسطِ ایشیا میں قیام کر
لیا تو اپنے پسندیدہ جانور مثلاً غزال، گھوڑے، ہرن، بلبل،
چکور اور پھول، جیسے نرگس اور گلاب کو بھول نہ سکے۔ چونکہ یہ وسطِ
ایشیا کے خشک ریگزار علاقوں میں مل نہیں سکتے تھے تو صرف ان کی
تصویروں پر قناعت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چند ماہر مصوروں نے
جانوروں اور پودوں کی شکلیں بادشاہی عنایات کے زیرِ سایہ بنانی
شروع کر دیں۔ مسلمانوں کی قوت جو تباہ ہو چکی تھی اس انقلاب کو
روک نہ سکی جو مصوری کے میدان میں قدم جما چکی تھی۔ اور بعد
ازاں جب منگول مسلمان ہو کر مغل بن گئے تو فنِ مصوری کے دُنیا بھر
میں سب سے عظیم مربّی بن گئے۔ چنگیزی خاندان کا عظیم ترین وارث
ہونے کے باعث بابر نے مصوری کے ایک نئے روپ کی تشکیل کی
جو "مغل فنِ مصوّری" کے نام سے مشہور ہے۔ دہلی میں
قیام کرنے کے بعد مغل طرز کے باغ کی تعمیر بابر کے اول ترین کاموں
میں سے ایک ہے جو اس کے کابل کے باغ کے طرز پر بنایا گیا تھا جو
بعد کے باغوں کے لئے ہندوستان بھر میں ایک نمونہ بن گیا، جس میں
جھرنے، فوارے، پھول، کبوتر خانے اور روشنی کا انتظام مخصوص
ہے۔ میسور کے قریب کرشنا راج ساگر میں بنایا ہوا مشہور برنداون
گارڈن جس کو ریاستِ میسور کے دیوان سر مرزا اسماعیل نے بنایا تھا،

دراصل کشمیر کے شالیمار باغ کی طرز پر ہے جس کی تعمیر بابر کے وارث جہانگیر نے کی تھی۔

یہ تمام نکتے بابر کی نفسیات کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس نے ہندوستان میں داخل ہونے کے بہت پہلے ہی شاہ اسماعیل صفوی کے اماموں کی تصویریں اپنے سکّوں پر ضرب کر دی تھیں۔ اتنی حد تک اس نے اسلام کی حدود سے بھی تجاوز کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ خود اپنے مذہب پر سختی کے ساتھ قائم نہ تھا۔ مذہبی نظریات اور جذبات سے متعلق کسی پر اچھے یا برے ہونے کی بات کرنے سے پہلے اس کی شخصیت کے اِس پہلو پر غور کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اِس سبب سے بابر کو کسی بھی صورت میں بُت شکنی کی طرف مائل ہونے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔

(۱۹)

بابر اور ہندوستانی تمدّن

اسلام کے پیرو ہندوستان میں بہت پہلے آئے۔ عربوں کے سندھ فتح کرنے کے بعد جو اختلاط ہُوا وہ صرف ذہنی حد تک رہا۔ عربوں کے اس داخلہ (نویں صدی) کے بارے میں لکھتے ہوئے سٹینلی لین پول بیان کرتے ہیں کہ " یہ ایک ہندوستان اور اسلام کا ایسا واقعہ ہے جو فاتحانہ ہے، لیکن اس کے کچھ نتیجے نہ نکلے۔"

یہ بابر تھا جس نے نہ صرف یہ کہ مغل حکومت کو مجتمع کیا بلکہ اس نے ہندوستان کو ایک ملا جلا تمدّن بھی دیا۔ یہ ملا جلا تمدن شمالی ہندوستان میں بہت نمایاں ہے جو نہ ہندو تمدن ہے نہ اسلامی بلکہ ہندو مُسلم تمدن یا ہند ایرانی تمدن ہے۔

یہ ابتدائی مسلمان ہی تھے جنھوں نے ہزاروں طبقوں، جاتیوں، جماعتوں اور مذہبوں میں بٹے ہوئے ان لوگوں کو ایک نام "ہندو" دیا۔ لفظ ہندو کسی بھی مقدس کتاب میں موجود نہیں اور نہ ہی آچاریوں کے لکھے ہُوئے تبصروں میں۔ یہ سنسکرت لفظ نہیں ہے۔ اس کا مخرج سنسکرت نہیں بلکہ فارسی ہے۔ اور دریائے سندھ سے جڑا ہُوا ہے جس کو پار کر کے مسلمان ہندوستان میں داخل ہُوئے۔

مقامی روایتوں کے مطابق ہندوستان کا نام " جمبودیپ" " بھارت ورش" اور بعد ازاں " بھارت" ہے۔ یہ

مسلمان تھے جنہوں نے اس کو ہندوستان کا نام دیا۔ لفظِ "ہندو" مسلمانوں کے بہت سارے ناموں کا ایک حصّہ ہے اور لفظ "ہند" مسلمانوں کی بہت ساری تنظیموں سے جُڑا ہُوا ہے۔ ہندو بیگ بابر کے ایک فوجی افسر کا نام تھا۔ اس کے ایک بیٹے کا نام ہندال (ہندوستان کا بچہ) تھا۔ لفظ ہندو کسی بھی ہندو سادھو یا مٹھادی پتی کے نام کے ساتھ ملا ہُوا نہیں دیکھا جاتا۔ عام لوگوں کی بات ہی کیا ہے۔ تمام مٹھ اور جگت گرو جاتیوں سے جُڑے ہُوئے ہیں۔ کوئی بھی مٹھ ایسا نہیں ہے جس کو جملہ طبقات یکساں قبول کرتے ہوں۔ کٹّر برہمن، رام کرشن مشن سے صرف اس لئے پرہیز کرتے ہیں کہ یہ جاتیوں کے فرق سے بَری ہے۔

آدی شنکر برہما سُترا پر لکھے ہُوئے اپنے تبصرے "برہما سُترا بھاشیا" میں منوسمرتی اور گوتم دھرم سُوتر کے حوالے سے اس بات کو درست مانتے ہُوئے لکھتے ہیں کہ چوتھے درجے کی ذات والے شودر اگر ویدوں کی آواز کو سُن لیں تو ان کے کانوں میں پگھلتا ہُوا سیسہ اور موم بھر دینا چاہیئے۔ اگر وہ وید کے الفاظ کہہ دیں تو ان کی زبان درمیان سے کاٹ دینی چاہیے وغیرہ۔ ان چار جاتیوں سے بھی نیچے یعنے اَوَرنیا یا پنچما قرار دیئے گئے پانچویں گروہ کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ اس کا اندازہ ہم خوب لگا سکتے ہیں۔

بہرحال عام لفظ "ہندو" جو مسلمانوں نے دیا ان تمام لوگوں پر حاوی رہا۔ مغلوں کے دور میں لفظ ہندو کے معنی

تھے، غیر مسلم اہلِ ہند جو پارسی اور عیسائی نہیں ہیں۔

وارن ہیسٹنگس نے 1772 میں پہلی بار لفظ ہندو کو ان قوانین کے ساتھ جوڑ دیا جن کی بنیادیں سمرتی اور شروتی سے ملی ہوئی ہیں۔ انگریزی عدالتوں میں سہولتوں کے پیش نظر یہ اس لئے کیا گیا کہ اس کے ذریعے مقامی لوگوں کے معاملے طے کئے جائیں۔ جب برطانوی حکمرانوں کو لفظ ہندو کے صاف مطلب کی ضرورت ہوئی تو بال گنگا دھر تلک اور مدن موہن مالویہ سے اس کی صراحت طلب کی گئی تو انہوں نے بتایا کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو ویدوں پر یقین یا ایمان رکھتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے اس برساتی کو ختم کر ڈالا جس کے سائے میں مسلمانوں نے ان سب کو ملا کر رکھا تھا۔ اس طرح بدّھی، جین، سکھ اور آج کل لنگایت جو ویدوں پر یقین نہیں رکھتے، تمام کے تمام ہندو زمرے سے باہر ہو گئے۔ کیونکہ یہ سب احتجاجی Protestant مذاہب تھے۔

ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر لگاتار یہ کہتے رہے کہ دلیت اور دوسرے روندے ہوئے طبقے "ہندو" نہیں ہیں۔ اس کا مطلب ہوا کہ ہندوستان کی 80 کروڑ آبادی کا 85 فیصد حصّہ "ہندو" نہیں ہے۔

کرناٹک کے معزّز ترین شاعر ڈاکٹر کے وی پٹپّا کہتے ہیں کہ ان کے ایّامِ طالب علمی میں انہوں نے سنسکرت سیکھنے کی خواہش کی۔ لیکن استاد نے اُن کی ذات کے بارے میں تحقیق کی اور سنسکرت کی کلاس سے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔

آدی شنکرا کا فیصلہ کہ کس کو ویدوں کے علم سے محروم

رکھنا چاہیے۔ منو کے صریح احکامات اور تلک کے دئے ہوئے لفظ "ہندو" کے مطلب اور ڈاکٹر کے وی پٹپا کے تجربے سے جوڑ دیں تو بہت بڑی تعداد میں بہت ساری ذاتیں ہندو مت کے زمرے سے باہر ہو جاتی ہیں۔

تو پھر، "ہندو" کون ہے؟ اس کا کوئی صاف اور یقینی جواب نہیں مل سکتا۔ اس کا کوئی مثبت مطلب نہیں ہو سکتا، صرف منفی مطلب نکالا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر نے ہندو کوڈ بل (1956) تحریر کی۔ آج کا تحریری ہندو قانون لفظ "ہندو" کی منفی طور پر تصریح کرتا ہے۔ یعنی وہ سب جو مسلمان، عیسائی، پارسی اور یہودی نہیں ہیں۔ یہی مطلب مغلوں کے دور میں لیا گیا تھا۔ آج پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے ہندو قانون کا مطلب بہت سے معاملات میں سمرتی اور شروتی کے خلاف ہے۔

اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ہندو سوسائٹی کے نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ صرف ایک دوسرے پر جلنے اور شک کرنے والی مختلف جماعتوں، طبقوں، ذیلی طبقوں، جاتیوں اور ذیلی جاتیوں کے چوں چوں کے مربہ کا نام ہے اور اسی لئے خشونت سنگھ نے بنگلور میں یکم نومبر 1987 کے دن چندہ اکٹھا کرنے والی تقریر میں "ہندو۔ ہندو جھگڑے" اور "ہندو قوم کے اندرونی فسادات" کے بارے میں کہا۔

جب لگاتار اور انتہائی حد تک دہرائے جانے والے الفاظ کا مطلب صریح نہیں ہوتا تو خیالات پریشان اور اعمال غلط سلط ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کی بہت ساری پریشانیاں اسی بنیادی پریشانی کے سبب ہیں۔ یہی ہمارے وقت کی جملہ بڑی سماجی بیماریوں کا بنیادی سبب ہے، یعنی

اونچے ذاتیوں کا گھڑا ہُوا ہندو رجعت پسندانہ نظریہ جو اپنے آپ کو قومی
دھارے کے نام پر ظاہر کرتا رہتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ "قومی دھارے"
کے نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ بہت سارے چھوٹے چھوٹے اور آپس میں
ٹکرانے والے دھارے ہیں۔ یہ کھوکھلا محاورہ "قومی دھارا" ایک آسان
ڈنڈا بنالیا گیا ہے جس سے مسلمانوں کو پیٹا اور دلیتوں کو دھمکایا جاتا ہے۔
اس سے کوئی اور مقصد پورا نہیں ہو رہا ہے۔ (وی۔ ٹی۔ راج شیکھر
Agression on Indian culture
ہندوستانی تمدن پر حملہ)

آئیے ہم بابر کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ آر سی مجمدار کے مطابق
بابر محض ایک جری مہم جو سپاہی نہیں تھا بلکہ بہت ہی اچھا ادبی ذوق رکھنے
والا صاحب دل بھی تھا۔ فارسی کا سلجھا ہُوا شاعر تھا۔ سٹینلی لین پول لکھتا ہے کہ
بابر ترکی نثر اور شاعری کا ایک اُستاد تھا۔ اس نے ہندوستان کو مغل
تمدن دیا۔ نئی اور برتر دستکاریاں دیں۔ فنِ تعمیر، مُصوری اور باغبانی
میں نُدرتیں پیدا کیں۔ اس کی سوانح حیات ادبِ انسانی میں بڑا اونچا
مقام رکھتی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ مسز اینٹ سوسنا بیوریج نے کیا ہے۔
اس کا فرانسیسی ترجمہ 1871 میں ہُوا۔ اس کے ترکی اشعار کا ایک چھوٹا
سا مجموعہ بھی ہے۔

اس نے روزنامچہ اور ادبی شہ پارے ایسے دور میں لکھے جبکہ
اس کے ہم عصر یورپ کے بادشاہ ٹھیک طور سے پڑھنے کی عادت
بھی نہیں رکھتے تھے۔

بہت سارے پکوان کے برتن، لباس، مٹھائیاں اور مصالحے،
طعامات، موسیقی کے ساز، گرامر اور زبان اور تلفظ کے اندازِ بیان

جو آج ہندوستانی تمدن کے جزو ہیں، سب کے سب مسلمانوں کی دین ہیں۔ جیساکہ لفظ "ہندو" ہے۔ اسی طرح بہت سارے لباس جیسے "جبہ" پائجامہ، شال، شلوار، قمیص، چوڑی دار اور بہت ساری ماکولات جیسے جامون، جہانگیر، جلیبی جو ہندوؤں میں اتنے پسندیدہ ہیں سب کے سب ایرانی یا اسلامی دین ہیں۔ بابر کا اثر ہندوستان پر اتنا گہرا اور اتنا شریفانہ ہے جتنا کہ ہٹلر کا اثر ہندوستان کی معیشت پر فیصلہ کن اور تباہ کن ہے۔ اس کا انتہائی قومی اور ذہین دماغ تھا جو ہیرے سے سخت ہو سکتا تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ پھول سے زیادہ نازک، گہری تنقیدی بصیرت سے بھرپور تھا۔

جب اس کو معلوم ہوا کہ خود اس کے عمّال لوگوں کو ستاتے ہیں تو اس نے ان کو سزا دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ کبھی کبھی تو اس نے ان کی ناکیں کٹوا دیں تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔

بابری مسجد کے تعلق سے پھیلے ہوئے انتشار سے مسلم مخالف گہرے تعصب اور جھوٹ کی دبیز چادر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس کے پیچھے ہم تاریخ کی سچائی دیکھنا چاہتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ کتاب سچ کو تعصب اور جھوٹ کے حملوں سے بچانے میں کچھ کارگر ہوگی۔

رسم اجراء کی رپورٹ اور ہندو میڈیا

رسمِ اجراء کے وقت عزت مآب بی ین پانڈے صاحب نے فرمایا :

"ہندو بنیادیت پسند انتخابات کو مدنظر رکھتے ہُوئے بابری مسجد کے بارے میں جھوٹی تاریخ لکھ کر عام ہندؤں کو گمراہ کر رہے ہیں تاکہ ہندو اقتدار قائم ہو۔ اگر یہ لوگ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگئے تو وہ دن ہندوستان کے لئے بہت افسوسناک دن ہوگا۔"

بنگلور دُور درشن نے یہ خبر اسی شام کو سُنائی۔ پی ٹی آئی نے اس کو پھیلایا۔ لیکن یہ خبر بنگلور کے صرف ٹائمس آف انڈیا (انگریزی) اور سالار (اُردو) میں شائع ہوئی۔ دوسرے تمام اخبارات نے اس خبر کو روک دینے کا اہتمام کیا۔ ہم اس بات پر اس لئے زور ڈال رہے ہیں کہ ہندؤں کے ہاتھ میں موجود میڈیا مسلمانوں کے لئے فائدہ بخش خبروں کو ڈھانک دیتا ہے۔

تعارف
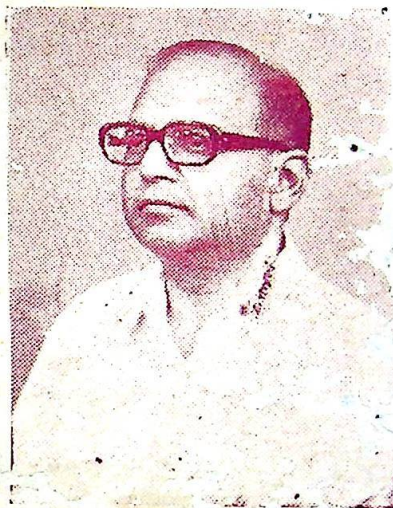
پی یس سریدھر مورتی بنگلور کے ایک کامیاب سینیر ایڈوکیٹ ہیں۔ بی اے میں انگریزی ادب پر گولڈ میڈل حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا خاص میدان ہندو مت اور ہندو فلسفہ ہے۔ بھگوت گیتا پر تشریح لکھ کر انہوں نے چنمیا نند ا گولڈ میڈل حاصل کیا اور چنمیا مشن کے "تیاگی" میں اس کی اشاعت ہوئی۔ راجہ جی کی سوانح حیات پر ایک ضخیم کتاب کنڑا زبان میں لکھی اور حکومت کرناٹک کے لئے انہوں نے انڈین کنٹریکٹ ایکٹ کا ترجمہ کنڑا زبان میں کیا اور فی الحال ہندو کتابوں کے مشہور نقاد ناراۃ دینکیٹشور کی راماین پر تنقید کے انگریزی ترجمہ میں لگے ہیں اور ایک اور تاریخ نثر ایمارہ، سیواجی اور اورنگ زیب" کی تحریر میں لگے ہیں۔ راجہ جی کے جریدے "سوراجیہ" کے کافی عرصے تک نمائندہ رہے۔

پی یس سریدھر مورتی، ایڈوکیٹ

اسلام اور مسلمانوں پران کا بہت تحقیقی مطالعہ ہے اور ان کے تعلق سے غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے ان کا قلم ہمہ وقت تیار رہتا ہے اور اخباروں کے قارئین کے کالم میں ان کے خط فوراً پہنچتے ہیں اور بسا اوقات ان کے انگریزی اخبارات میں شائع شدہ خطوط کے ترجمے اُردو اخبارات کی زینت بن جاتے ہیں۔ ان کا کامن سول کوڈ پر ایک شاندار مضمون مسلم لاز پروٹیکشن کمیٹی نے کنڑا زبان میں شائع کیا۔ پندرہ روزہ "دلیت وائس" میں اکثر ان کے مضامین حقائق کو سامنے لے آتے ہیں۔ یہ کتاب خود ان کی ذاتی لیاقت اور اوصاف کو آپ پر اچھی طرح اُجاگر کر دے گی۔

الحاج نور احمد
بی ای - یم یس (یو یس اے)
سابق چیف انجنیر و
صدر مسلم لاز پروٹیکشن کمیٹی بنگلور

مصنّف کا پتہ:
پی یس سریدھر مورتی، ایڈوکیٹ
نمبر 25 - گاندھی بازار - بنگلور 560004